۲۵۹

مرتب :
محمد حیات خاں سیال

میری لائبریری

گلاب کے پھول

محید امجد : شخصیت ، فن اور منتخب کلام

میری لائبریری میں

گلاب کے پھول

میری لائبریری
(۲۵۹)

میری لائبریری کی دوسری دل خوش کُن کتابیں

حماقتیں — شفیق الرحمٰن
مزید حماقتیں — شفیق الرحمٰن
لہریں — شفیق الرحمٰن
پرواز — شفیق الرحمٰن
دغاباز — مترجم کمال احمد رضوی
لفنگے کی ڈائری — مترجم کمال احمد رضوی
شیشہ و تیشہ — کنہیا لال کپور
سنگ و خشت — کنہیا لال کپور
چنگ و رباب — کنہیا لال کپور
نوکِ نشتر — کنہیا لال کپور
بال و پر — کنہیا لال کپور
نرم گرم — کنہیا لال کپور
گرد کارواں — کنہیا لال کپور
ٹاہلی دے تھلے (پنجابی) — اشفاق احمد
پریم چند کے بہترین افسانے — خواجہ زکریا
میرزا ادیب کے بہترین افسانے — عرش صدیقی
خیالستان — سجاد حیدر یلدرم

تل پھل (پنجابی) — کنہیا لال کپور
اندیشۂ شہر — احمد جمال پاشا
راجہ صاحب — شوکت تھانوی
گرما گرم (لطیفے) — اشفاق احمد
محفلِ معمہ گوئی (مصوّر) — منظور الحق صدیقی
زنگا رنگ (لطیفے) — ترتیب شہناز ہمایوں
پڑھو اور ہنسو — میاں محمد ابوالفتح
اُردو کا بہترین انشائی ادب۔
(مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی)
مشاہیر کے لطیفے اور چٹکلے۔
(مرتب عطش درانی)
سگ بیتی، مرتب ارشد میر
دلیلِ سحر (نیا مجموعہ) — کنہیا لال کپور
کاغذی شیر — علی احمد
ندیم کے بہترین افسانے — منظفر علی سید
زادِ راہ — پریم چند
زمزمۂ محبت — ابوالکلام آزاد

گلاب کے پھول

مجید امجد — شخصیت، فن اور منتخب کلام

مرتبہ
محمد حیات خاں سیال

مکتبہ میری لائبریری لاہور۔۲

اشاعت اوّل : ۱۹۷۸ء

ناشر : . . . . بشیر احمد چودھری

ڈائرکٹر مکتبہ میری لائبریری لاہور

طابع : . . . . آر بشیر پرنٹرز لاہور

سخن فہم اور مجید امجد کے طرفدار

ڈاکٹر وزیر آغا

اور

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

——— کے نام

ترتیب

۱۔ ابتدائیہ	محمد حیات خاں سیال	۹
۲۔ تعارف	تقی الدین انجم	۱۷
۳۔ مجید امجد سے ایک انٹرویو	ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا	۲۲
۴۔ کوئی سدھارتھ	شیر افضل جعفری	۳۶
۵۔ شہید تنہائی	بلال زبیری	۴۸
۶۔ مجید امجد خرقہ پوش وپابہ گل	ڈاکٹر وزیر آغا	۶۰
۷۔ مجید امجد اوران کی شاعری	سید جعفر طاہر	۷۴
۸۔ مجید امجد کی غزل	انور سدید	۸۳
۹۔ سوچ کی بے حرف لو کا شاعر	طاہر تونسوی	۱۰۵
۱۰۔ مجید امجد — ایک مطالعہ	بلراج کومل	۱۱۳
۱۱۔ مجید امجد — دانشوروں کی نظر میں	شمیم حیات سیال	۱۳۸

انتخاب کلام

(ا) غزلیں	۱۴۷
(ب) نظمیں	۱۶۹

فہرست

غزلیں

۱۔ جنونِ عشق کی رسم عجیب کیا کہنا ۱۴۹
۲۔ کیا روپ دوستی کا کیا رنگ دشمنی کا ۱۴۹
۳۔ ایک ایک جھرو کا خندہ بلب ایک ایک گلی کہرام ۱۵۰
۴۔ اس اپنی کرن کو آتی ہوئی صبحوں کے حوالے کرنا ہے ۱۵۱
۵۔ مہکتے میٹھے مستانے زمانے ۱۵۲
۶۔ دل سے ہر گزری بات گزری ہے ۱۵۲
۷۔ روش روش پہ ہیں نکہت فشاں گلاب کے پھول ۱۵۳
۸۔ جھونکوں میں رس گھولے دل ۱۵۴
۹۔ جو ہو سکے تو میرے دل اب ایک وہ قصہ بھی ۱۵۵
۱۰۔ جاودان قدروں کی شمعیں بجھ گئیں تو جل اٹھی تقدیرِ دل ۱۵۶
۱۱۔ بچا کے رکھا ہے جن کو غروبِ جاں کے لئے ۱۵۷
۱۲۔ صبحوں کی وادیوں میں گگلوں کے پڑاؤ تھے ۱۵۸
۱۳۔ قاصد مست گام موج صبا ۱۵۹
۱۴۔ اب یہ مسافت کیسے طے ہو اے دل تو ہی بتا ۱۵۹
۱۵۔ سفر کی موج میں تھے وقت کے غبار میں تھے ۱۶۰
۱۶۔ اور اب یہ کہتا ہوں یہ جرم تو روا رکھتا ۱۶۱
۱۷۔ میری مانند خود نگر تنہا ۱۶۲
۱۸۔ کیا کہیئے کیا حجاب حیا کا فسانہ تھا ۱۶۴
۱۹۔ برس گیا بہ خراباتِ آرزو ترا غم ۱۶۴
۲۰۔ جب اک چراغ راہ گزر کی کرن پڑے ۱۶۵
۲۱۔ سنے یہ زہر ہی وجہ شفا جو تو چاہے ۱۶۶
۲۲۔ ہر وقت فکرِ مرگِ غریبانہ چاہیئے ۱۶۶

نظمیں

۱۔ حسن	۱۷۱
۲۔ گلی کا چراغ	۱۷۲
۳۔ خودکشی	۱۷۴
۴۔ جینے والے	۱۷۶
۵۔ واماندہ	۱۷۷
۶۔ طلوعِ فرض	۱۷۸
۷۔ نیوار ڈی	۱۸۱
۸۔ امروز	۱۸۳
۹۔ ایک کوہستانی سفر	۱۸۵
۱۰۔ آٹوگراف	۱۸۶
۱۱۔ افسانے	۱۸۸
۱۲۔ متروکہ مکان	۱۸۹
۱۳۔ ہوٹل میں	۱۹۱
۱۴۔ ایکٹریس کا کنٹریکٹ	۱۹۲
۱۵۔ ننھے بچو	۱۹۴
۱۶۔ حضرت زینب رض	۱۹۵
۱۷۔ گھور گھٹاؤں کے نیچے	۱۹۷
۱۸۔ ائیرپورٹ تے	۱۹۷
۱۹۔ کنگن	۱۹۸
۲۰۔ میرے سفر میں	۱۹۹
۲۱۔ کالے بادل	۲۰۰
۲۲۔ کچھ دن پہلے	۲۰۲
۲۳۔ نہ کوئی سلطنتِ غم	۲۰۳
۲۴۔ مرے خدا مرے دل	۲۱۸
۲۵۔ کون دیکھے گا	۲۲۴
۲۶۔ ریلوے سٹیشن پر	۲۲۵
۲۷۔ توسیع شہر	۲۲۷
۲۸۔ سپاہی	۲۲۸
۲۹۔ سبز پیڑوں کے سائے	۲۳۰
۳۰۔ موانست	۲۳۲
۳۱۔ ثمرِ خوں	۲۳۳
۳۲۔ جیون دیس	۲۳۴
۳۳۔ ایک فلم دیکھ کر	۲۳۶
۳۴۔ بھکارن	۲۳۸
۳۵۔ جویا	۲۳۹
۳۶۔ یہ سب دن	۲۴۱
۳۷۔ گزشتہ امن	۲۴۳
۳۸۔ باگیں موڑ بھی لے	۲۴۵
۳۹۔ کون دیس گیو	۲۴۶
۴۰۔ زندگی اے زندگی	۲۴۸
۴۱۔ ہری بھری فصلو	۲۵۰
۴۲۔ سہرا	۲۵۲

ابتدائیہ

۱۹۷۰ء میں میں نے جھنگ کے معروف شعراء کا منتخب کلام جمع کرنے کا ایک منصوبہ بنایا اور اس سلسلے میں بہت سا مواد جمع بھی کر لیا۔ چنانچہ حضرت مجید امجد نے ایک خط میں اپنے حالاتِ زندگی اور شبِ رفتہ کی منتخب غزلیں اور نظمیں لکھ بھیجیں۔ شبِ رفتہ کے بعد کا کلام چونکہ وہ منتخب نہیں کر پاتے تھے اس لئے انہوں نے یہ کام میرے سپرد کر دیا کہ بقیہ کلام سے میں خود ہی انتخاب کر لوں چنانچہ اس انتخاب میں وہ نظمیں اور غزلیں شامل ہیں جس کی نشاندہی انہوں نے فرما دی تھی۔

اپریل ۱۹۷۴ء میں جب مجید امجد مرحوم یہاں جھنگ تشریف لائے تو ان کے دوستوں بشیر محمد شعری اور پروفیسر تقی الدین انجم نے اصرار کیا کہ اب وہ ساہیوال چھوڑ کر جھنگ آجائیں۔ مجید امجد رضامند ہو گئے اور کہہ دیا کہ اپریل کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے جھنگ آجائیں گے۔ کیسے معلوم تھا کہ ۱۱ مئی کو ان کا جسدِ خاکی جھنگ میں دفن ہونے کے لئے پہنچے گا۔ بہرحال انہوں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے کالج میگزین کے لئے انہوں نے جو غزل دی تھی اس کی

تاریخ تحریر ۱۱/۳ ۱۹ا ہے اور اس میں یہ شعر بھی تھا: ؎

اب درد شش بھی سانس کی کوشش میں ہے شریک
اب کیا ہو، اب تو نیند کو آجانا چاہیئے

مجید امجد اپنے دَور کے عظیم شعرا میں سے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس درویش صفت انسان کی وہ قدر و منزلت نہ ہوتی جس کے وہ مستحق تھے۔ تاہم ان کی زندگی میں ڈاکٹر محمد حسن، مظفر علی سید، ڈاکٹر وحید، ڈاکٹر وزیر آغا اور خواجہ محمد زکریا نے مضامین لکھ کر اہلِ نظر کو متوجہ کیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے مداحین کا ایک وسیع حلقہ پیدا ہو گیا ہے اور ان کے فن پر متعدد مقالات لکھے جا چکے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں۔ ان کا تقریباً تمام کلام چھپ چکا ہے اس لئے ان کی ذہنی اور فکری استعداد کا جائزہ لینا آسان ہو گیا ہے۔ بیشتر نقادانِ فن نے انہیں اس دَور کا عظیم شاعر قرار دیا ہے۔

مجید امجد نے ہر بڑے شاعر کی طرح موضوعات، زبان اور ہیئت کے مختلف تجربے کئے اور نظم کی روایت کو آگے بڑھایا۔ "ان کی شاعری کو پرانے تنقیدی معیار سے نہیں پرکھا جا سکتا۔ کیونکہ ہر بڑا شاعر جب نئے تجربات کرتا ہے تو ان کی شاعری کو پرکھنے کے نئے نئے معیارات وضع کرنے پڑتے ہیں۔ لہٰذا مجید امجد کے شعری مرتبے کا حقیقی تعین تو کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ہی ہو سکے گا جب ان کے نئے لہجے اور نئی سوچ تک رسائی حاصل کر کے نقاد انہیں نئے زاویوں سے پرکھیں۔" احمد ندیم قاسمی نے ٹھیک کہا ہے کہ مجید امجد کو رفعتِ مقام بھی حاصل ہے اور شہرتِ دوام بھی۔

البتہ اس رفعت کے ادراک اور شہرت کے اعتراف میں دیر ہو رہی ہے اور وجہ صرف یہ ہے کہ وہ معمول کا شاعر نہیں تھا۔ اس کے لہجے کے دھیمے پن میں جو کاٹ ہے اس سے ہم مانوس نہیں ہیں اور اس کے طرزِ اظہار میں جو انوکھا پن ہے اس کے ہم عادی نہیں ہیں۔

میں جناب شیر محمد شعری، محترم تقی انجم علیگ، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، مبین تابش، سمیع اللہ قریشی، سجاد نقوی اور عبدالکریم بھٹی (برادرِ خورد مجید امجد) کا ممنون ہوں جنہوں نے انتخابِ کلام کے سلسلے میں مفید مشوروں سے نوازا۔ انجم صاحب مجید امجد سے بہت قریب رہے ہیں اور شعر و سخن میں مجید امجد آپ سے مشورہ لیتے تھے۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ انجم صاحب نے ان کی شاعری پر کچھ نہیں لکھا اس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ انہیں مجید امجد سے اتنا جذباتی لگاؤ ہے کہ ان کا قلم رک جاتا ہے۔ ایک دن میں نے انجم صاحب سے درخواست کی کہ کچھ تاثرات تو دیجئے وہ بولتے گئے اور میں تیزی سے لکھتا گیا اور اس طرح تعارف کی چند سطریں میسر آگئیں۔

انتخابِ کلام کا عنوان مجید امجد کے اس شعر سے ماخوذ ہے جو سنگِ مزار پر کندہ ہے: ؎

کٹی ہے عمر بہاروں کے سوگ میں امجدؔ
مری لحد پہ کھلیں جاوداں گلاب کے پھول

محمد حیات خاں سیال
جھنگ صدر

۲۱/۹/۷۶

برادرم مجید امجد اپنے دور کے اہم شاعر تھے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ جیتے جی ان کی وہ قدر و منزلت نہ ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ ان کی وفات کے بعد نقادانِ فن نے ان کے کلام کا گہرا مطالعہ شروع کیا۔ متعدد مقالات تحریر کئے گئے اور ان کا تمام کلام بھی شائع ہوگیا۔

پروفیسر محمد حیات خاں سیال کو برادر عزیز مجید امجد سے ایک تعلق خاص رہا ہے۔ اب وہ مجید امجد کی شخصیت اور فن پر لکھے گئے مقالات اور ان کے منتخب کلام کا ایک حسین مرقع پیش کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ مجید امجد کی شاعری کو سمجھنے کے لئے یہ انتخاب نہایت مفید ثابت ہوگا۔

عبدالکریم ایم۔ اے

(برادر خورد مجید امجد)

مورخہ ۲۱/۷/۷۷ جھنگ صدر

محترمی سیال صاحب

تسلیم!

فوٹو ارسال ہے۔ سوانحی نوٹ لف ہے۔ آپ میری حسب نظمیں بھی شامل کرلیں۔ یہ نظمیں "شب رفتہ" میں شامل ہیں۔ شب رفتہ آپ کے پاس یا آپ کے کالج میں ہو تو میں بھجوادوں گا۔ اس مجموعے میں میرا منتخب کلام درج ہے (بعد کا کلام جو رسائل میں چھپا ہے اس کا میں انتخاب نہیں کر سکا تا حال)

۱۔ حُسن
۲۔ طلوعِ فرض
۳۔ امروز
۴۔ واماندہ
۵۔ کون دیس گیہ
۶۔ غزل، ایک ایک جھروکا خندہ بلب
۷۔ غزل، جھکتے میٹھے مستانے زمانے
۸۔ غزل، دل سے ہر گزری بات گزر ...

کتاب آپ کی کب تک چھپ جائے گی

آپ کا
مجید امجد

۷۰/۹/۲۶

تاریخ پیدائش ۲۹ جون ۱۹۱۴ء
ولادت جھنگ مگھیانہ

۱۹۳۰ء میں اسلامیہ ہائی سکول سے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۲ء میں گورنمنٹ کالج جھنگ سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان اور ۱۹۳۴ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ چند دن ایک قانون گو صاحب کے ماتحت ۱۹۳۵ء کے آئین کے تحت ووٹروں کی لسٹیں بنانے کا کام کیا۔ کچھ دن ایمپائر آف انڈیا انشورنس کمپنی کا ایجنٹ رہا۔ اس کے بعد ۱۹۴۰ء تک اخبار عروج جھنگ کی ادارت کے فرائض انجام دیتے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اخبار عروج کو چھوڑنا پڑا اور دفتر ڈسٹرکٹ بورڈ کے ایک شعبہ میں تین چار سال کام کیا۔ ۱۹۴۴ء میں سرکاری ملازمت اختیار کی اور لائل پور، گوجرہ، سمندری، تاندلیاں والا، جڑانوالہ، چیچہ وطنی، مظفر گڑھ لیہ، منٹگمری، پاک پتن، اوکاڑہ، عارفوالہ، راولپنڈی، لاہور، شاہدرہ تعینات رہا۔ آج کل ساہیوال میں ہوں۔ اس عرصے میں شعر کے لئے کس وقت خامہ فرسائی کی ہے۔ یاد نہیں پڑتا جہاں بھی رہا ہوں۔ دیار جھنگ کی عطا کی ہوئی وارفتگی میرے ساتھ رہی ہے۔

اسعد
۲۷/۹/۷۰

وفات ۱۱ مئی ۱۹۸۷ء

۱۹۷۳ کی آخری غزل

جسم تو ہیں نئی صبحوں کے داعی بھی ۔ ہے ختم پر یہ سماں اب ترا قرنِ آخر بھی

مری ہی عمر تھی جو بیت گئی رائیگاں سمجھی کسی کے پاس تو تھا ایک سانس وافر بھی

خود اپنے عیب میں تن پاس آیا اٹھا کھیلو ہیں اس جہان کے کیسے ملے میں حاضر بھی

میں یہ سمجھا وہ جو پھر مڑ لیا یہ آپ ملی کیجے اسی کا غصہ ہے میرا سکونِ خاطر بھی

میں اس جہاں میں آدم بھی اپنے صورت پہ ہوں ہیں اس کے ذہن میں ہرن اپنی خطا سے منکر بھی

یہ کس کے اذن سے ہیں اور یہ کیا زمانے ہیں جو زندگی میں ہے کہ ساتھ ہی مسافر بھی

ہیں تیری گھات میں مجید جو آسمانوں کے ذہن
ذرا بہ پاسِ وفا اُن کے دام میں گر بھی ----!

مجید امجد

30. 1. 74

نذرِ شعری صاحب

تقی الدین انجم (علیگ)

تعارف

"مجید امجد اچھے انسان اور اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ ان کی انسانیت اور شاعری کی عظمت ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں۔ بہت سے لوگوں نے انہیں بحیثیت انسان اور بحیثیت شاعر اپنے اپنے زاویہ نظر سے پرکھا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجید امجد خود جو کچھ تھے اور ان کی شاعری جس معیار کی ہے اس تک پہنچنے کے لئے بہت بڑے ماہر نفسیات اور اور بجل نقاد کی ضرورت ہے، انگریزی تنقید کی کتابوں کے مروّجہ پیمانوں سے ان کی شاعری کو سمجھنا ناممکن ہے، جو مجید امجد کو پوری طرح سمجھ سکتا ہے اور لکھنے پڑھنے کا ذوق بھی رکھتا ہے، وہی ان کی شاعری کے ساتھ انصاف کر سکتا ہے۔

ان کے بہت سے دوست مدّاح اور ثناخواں سب نے کچھ نہ کچھ ان کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں لکھا۔ بعض حضرات ان کی شاعری کے محرکات اور ان کی شخصیت کے بہت سے گوشے بے نقاب کرنے میں بہت حد تک کامیاب ہوئے لیکن مجموعی طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے چھ اندھے ایک ہاتھی کی ماہیت معلوم کرنے کے لئے نکلے تھے۔ ان میں سے جزوی طور پر ہر شخص ہاتھی

کی خصوصیات بیان کرتا تھا. لیکن اصل ہاتھی کی تصویر کوئی بھی نہ پیش کرسکا۔

مجید امجد کے ساتھ کچھ ایسا ہی معاملہ ہے :

دراصل مجید امجد ایک باشعور انسان کے اس جذبے کے ترجمان تھے جو حقیقت کی جستجو میں صدیوں بلکہ قرنوں سے لگا ہوا ہے. غالب نے مستانہ راہ وادیٔ خیال طے کرنا چاہی اور بازگشت سے بے نیازی کی تمنا کی. لیکن غالب عظیم ترین شاعر ہونے کے باوجود اپنی روایت سے پوری طرح الگ نہ ہوسکے. لیکن جو شوشہ وہ چھوڑ گئے، وہ کسی نہ کسی شکل میں ان کے بعد رنگ لاتا رہا. شاعری میں نئے تجربے ہوتے. تلازمہ خیال، تصورات، تاثرات، بحر و قافیہ کی زنجیریں توڑ کر بڑھتے رہے. اب یہ صنعت گر شاعر کا دستِ صنعت تھا کہ اس نے کتنی قسم کی تصویریں بنائیں. بیشتر حضرات اپنی ذات کے گرد گھومتے رہے. بہت سے ہجوموں اور ہنگاموں کے درمیان ہتھوڑیاں اٹھاتے شعر کی تخلیق کرتے رہے. مجید امجد نے اسی دور میں اپنے شعری تجربے پیش کئے ہیں. ان کے شعری تجربوں کی نوعیت نہایت ہی انفرادی ہے. لیکن اس میں فکر و خیال کی پاکیزگی، کائنات کی ماہیت بدصورتی کو مٹا دینے کا شوق اور خوبصورتی اور خوشبو کو پھیلانے کا جذبہ کارفرما تھا. اس جستجو میں انہوں نے کائنات کے ہر معمولی واقعے پر غور کیا اور اس میں وہ عظمت تلاش کرلی جو ہر معمولی واقعے میں ہوتی ہے. مگر نظر کسی کسی کو آتی ہے۔ ان تجربوں کا تقاضا یہ تھا کہ مجید امجد وہ سب کچھ کہتے جائیں جو ان کی روح محسوس

کر رہی ہے۔ دماغ کے محسوسات کچھ اور ہوتے ہیں اور روح کے کچھ اور ـــ مجید امجد نے جن غزلوں اور نظموں میں محسوسات کو ادراک کے معیار پر اتارنے کی کوشش کی ہے وہاں روایت کے قریب ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب انہوں نے کسی خیال یا جذبے کو اپنی روح میں سمو کر روحی قوت سے کام لے کر نظمیں کہی ہیں تو اس میں روایتی خیال سے بازگشت مشکل نظر آتی ہے۔ چنانچہ مجید امجد کے ہاں ابہام کی جو کیفیت ہے، وہ اسی روح عمل کی شاعرانہ شکل ہے جس میں ان کی شخصیت کے شمول سے ترفع اور پاکیزگی پیدا ہو گئی ہے۔

مجید امجد نے اپنی اکثر نظموں کا پس منظر راقم الحروف کو بتایا۔ بات اکثر بڑی معمولی ہوتی تھی۔ راقم الحروف نے ہمیشہ اسے بتنگڑ سمجھا، لیکن یہ بتنگڑ اس مفہوم میں نہیں جس میں آپ سمجھتے ہیں۔ بلکہ اس مفہوم میں کہ یہ کیمیاگر مٹی پر پھونک مار کر سونا بنانا چاہتا ہے۔ اکثر میں کہتا ہوں کہ اتنے چھوٹے سے موضوع پر اتنی بڑی نظم کیسے ہو گئی؟ وہ میرے ساتھ مسکراتے ہیں، میری نادانی کو پیار سے دیکھا ہے اور ان کی آنکھوں نے یہ بتایا ہے کہ بھائی دیدۂ عبرت حاصل کرو، اسی وقت قطرے میں دجلہ دکھائی دے گا۔ مجید امجد نے قطروں میں دجلہ، ذرّوں میں سورج اور شکستہ ٹھیکریوں میں جہانِ نو آباد دیکھے ہیں اور ان کے اس ذہنی عمل میں ماضی، حال اور مستقبل اپنی حدیں توڑ کر ایک دوسرے سے اس طرح گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ ایک ارضی انسان واقعی اپنے آپ کو معذور سمجھتا ہے کہ اس حقیقتِ اعلیٰ تک کیسے

پہنچے جن تک مجید امجد پہنچ گئے۔

۱۹۵۰ء میں مجید امجد نے نظم کی ہیئت نئے تجربے کے بارے میں ایک مرتبہ راقم الحروف سے گفتگو کی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ نظم میں دو ٹکڑوں میں جو خلا پیدا ہوتا ہے اس کو الفاظ کی ایسی ترتیب سے پُر کیا جائے کہ وہ ایک مسلسل خیال کی ترجمانی کر سکے۔ مجھے یاد ہے کہ اس سلسلے میں ارکان مفاعیل میں سے فعلن کو اہمیت وہی تھی اور اسں کے زحاف کو وہ اس میں شامل کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اکثر نظموں میں فعلن کی تکرار محض زحافات کی ہے۔ یہاں وہ روایت سے بھی ہٹے ہیں اور بحر کی ترتیب بھی بدل لی ہے۔ اور یہ سب کچھ انہوں نے اس لئے کیا کہ ان کے ذہنی اور روحانی سفر میں رکاوٹیں پیدا نہ ہوں۔ اس کے خیال کے مطابق یہ بات صحیح ہو سکتی ہے۔ ان کی نظمیں زیادہ تر طبع ہو چکی ہیں۔ نئے مجموعے بھی سامنے آتے ہیں۔ پڑھے لکھے لوگ آسانی سے مجید امجد کے اس موقف کو سمجھ سکتے ہیں۔ راقم الحروف سے اس سلسلے میں ان سے خط وکتابت رہی ہے اور چند خطوط راقم الحروف کے پاس شاید محفوظ ہوں۔ اس میں اتفاق و اختلاف دونوں صورتیں ہیں۔ وہ اپنی شرافتِ طبع سے مجبور تھے کہ کبھی کبھی معترض کی غلط بات کو بھی صحیح تسلیم کر لیتے تھے۔ لیکن اپنی دھن کے پکے تھے۔ ہیئت کے اس تجربے کو انہوں نے برقرار رکھا۔

شاعری کو شخصیت کے ساتھ منسلک کرنے کے پرانے رواج کا اطلاق کسی حد تک عام شاعروں پر بھی ہوتا ہے۔ مجید امجد کی بیرونی شخصیت کو سمجھنے والے

دوست ان کی شاعری کو اس سے منسلک کرکے معانی و مفاہیم نکالتے ہیں لیکن ان کی روحِ شخصیت کو کم لوگوں نے سمجھا ہے۔ مجید امجد کی شاعری کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے ان کی روحِ شخصیت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ روحی طور پر نہ وہ یاس پسند تھے نہ فکرِ معاش و روزگار کے بندھنوں میں جکڑے ہوتے تھے بلکہ وہ ایک ایسا بدن تھے جس کے اعضاء اپنے افعال و وظائف کسی اور طرح ادا کرتے ہیں اور روح و رجاتِ اعلیٰ پر پہنچ کر کسی اور طرح بدن کی شخصیت کا اظہار کرتی ہے۔ مجید امجد کی تمام نظمیں اسی روحی سفر کی تخلیق ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اپنے ماحول سے متاثر تھے۔ مجید امجد کی حیثیت سے وہ اِردگرد کی اشیاء کو اسی طرح دیکھتے تھے جس طرح عام آدمی دیکھتا ہے۔ وہ اس پر قلم اٹھاتے تھے تو وہ مجید امجد ان کا ساتھ چھوڑ جاتا تھا اور ان کے بلند و بالا قامت میں جو بلند و بالا روح اپنا عمل شروع کرتی تھی اور اسی عمل کے تحت وہ شعر کہتے تھے :-

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

مجید امجد سے ایک اِنٹرویو

س : امجد صاحب: سب سے پہلے ہم آپ کی زندگی کے کچھ حالات جاننا چاہیں گے:
ج : میں ۲۹ جون ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوا۔ میں نے اسلامیہ ہائی سکول جھنگ سے میٹرک پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج جھنگ سے ایف۔ اے اور اسلامیہ کالج لاہور سے ۱۹۳۴ء میں بی۔ اے کیا۔ ۱۹۴۴ء تک اخبار عروج جھنگ کا ایڈیٹر رہا۔ اسی سال موجودہ سرکاری ملازمت میں فوڈ ڈیپارٹمنٹ میں آ گیا۔ اس سلسلے میں لائل پور، گوجرہ، مظفر گڑھ، راولپنڈی، لاہور، منٹگمری میں زیادہ عرصہ گزرا۔ یہی کچھ سفرِ حیات ہے۔
س : آپ جھنگ جیسے شہر میں پیدا ہوتے۔ اور آپ نے کافی عرصہ وہاں گزارا ہے۔ کیا جھنگ میں اس زمانے میں کوئی شعری ماحول تھا؟ آپ کو شعر گوئی کی تحریک کیسے پیدا ہوئی؟
ج : شعر تو میں بہت عرصے سے کہتا ہوں۔ میں جب ساتویں جماعت میں تھا، تب بھی شعر کہتا تھا۔ نویں دسویں میں تھا تب بھی میں نے شعر کہے۔ اس زمانے کے شعر ایک کاپی میں جمع کرتے تھے۔ کاپی بعد میں تلف ہو گئی۔ جب میں لاہور

سے جھنگ واپس آیا تو اخبار "عروج" کے سلسلے میں مجھے پڑھنے لکھنے کا زیادہ وقت ملا۔ مسلسل آٹھ نو سال میں کھیتیا نوالہ بازار جھنگ کے ایک چوبارے کی تیسری منزل پر بیٹھا رہا۔ ان دنوں وہاں کئی ہندو اور مسلمان شعر کہنے والے موجود تھے۔ ان میں لالہ گوبند رام ناز، لالہ اودے لال شفق، صاحب علی شاہ، مولوی منظور علی توقف اور دیگر لکھنے والے بھی تھے۔ ہم چھوٹے چھوٹے تھے۔ پھر اپنے بہت سارے دوست تھے۔ شیر افضل جعفری، غلام محمد رنگین، کسری منہاس، امرناتھ، عباس شاد وغیرہ انہی کے ساتھ میں نے لکھا ہے اور پڑھا ہے۔ نظم زیادہ کہی۔

س: اس کی کیا وجہ ہے کہ اس زمانے میں جو بھی شعر کہتا تھا غزل گوئی کرتا تھا لیکن آپ شروع سے نظم گوئی کی طرف مائل رہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے!

ج: اس وقت کچھ معلوم نہ تھا، نہ اس وقت زیادہ تفریق قائم تھی۔ میری ابتدا کی جتنی چیزیں ہیں نظم میں ہیں۔ غزل کے ساتھ بھی کچھ عرصہ میرا لگاؤ رہا ہے ایک زمانہ تھا کہ میں ہر روز غزل کہتا تھا۔ پھر نظم اور اس کے مختلف اشکال کی طرف میری توجہ ہوئی۔ اس وقت کی نظم کی شکل اور اس وقت کی نظم کی ہر چیز مرتب ہوتی تھی۔ اس میں جس شخص نے بھی اضافہ کیا ہے وہ اس کی اپنی کاوش تھی اور ذاتی تجسس۔ اس وقت کوئی بنی بنائی چیز موجود نہیں تھی۔

س : ہیئتوں سے آپ کو اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہوئی ؟

ج : ہیئت سے اس لئے کہ سب سے پہلے تو مروجہ ہیئت تھی۔ مثلاً مثنوی، مثنوی کی مروجہ ہیئت میں شعر کہتے وقت یہ خیال ہوتا تھا کہ اس میں اپنی پابندیوں کے ساتھ کہہ سکوں تو ٹھیک ہے ورنہ اس میں ایک مصرعے کا دوسرے سے ٹکراؤ ہو جاتا تھا اور مثنوی کا ایک ایسا شعر جس میں پہلا مصرعہ دوسرے سے ربط رکھتا ہو بہت کم ہوتا تھا۔ چنانچہ میں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ اس کوشش کے سلسلے میں تجسّس سے مجھے آگے رستے ملے۔ مثلاً جب انگریزی شعراء کے طرز پڑھے جس میں چار چار لائنوں کا بند ہوتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس بند کی شکل اسی طرح رہے مگر مضمون رواں رہے۔ چنانچہ میں نے اس زمانے میں کچھ نظمیں اس قسم کی کہیں اور موضوع کے لحاظ سے مختلف ہیئتوں کے تجربے کئے۔

س : میں چند دن پہلے سوغات کا جدید نظم نمبر پڑھ رہا تھا۔ اس میں ایک نقاد نے لکھا ہے کہ آپ کی شاعری میں ایک بڑے شہر کا (IMAGE) ابھرتا ہے، آپ کی کیا رائے ہے ؟

ج : گزارش یہ ہے کہ ہر زمانے کے نقاد اس زمانے کے مروجہ سیاسی یا فلسفیانہ نظریات سے متاثر ہو کر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے جس زمانے کی اکثر یہ نظمیں ہیں۔ اس وقت ہندوستان اور پاکستان آزاد نہیں ہوئے

تھے، غلامی کے دور میں ناقدوں نے جس نظریے کو اپنایا ہی ترقی پسندانہ نظریے میں یہ چیزیں آتی ہیں۔ شہر کی زندگی، شہر کے مسائل۔ اس زمانے میں لکھنے والے مزدور اور اسی طرح کے طبقات کے متعلق کہتے تھے۔ چنانچہ اس دور کے ناقد اسی نظر سے دیکھتے تھے۔

س : میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کی شاعری میں جو کھیت، پگڈنڈیاں، درخت ہیں، ان سے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں چھوٹے شہر میں پہنچ گیا ہوں۔

ج : ٹھیک ہے آپ کی رائے صحیح ہے۔ نہ ہی میری زیادہ زندگی بڑے شہر میں گزری ہے۔ بڑے شہر کے ماحول پر چند نظمیں ہیں جیسے بس سٹینڈ پر۔ ورنہ اکثر چھوٹے شہروں کے بارے میں ہیں۔

س : ایک اور نقاد نے اس شمارے میں لکھا ہے کہ آپ کی نظموں میں OVER CIVILIZATION سے بیزاری پائی جاتی ہے کچھ نقادوں نے یہ بند لکھ کر : ؎

جیسے جزداں بھی اک بار گراں ہے وہ بچہ بھی سوتے کتب رواں ہے

لکھا ہے کہ یہ تعمیری نقطہ نظر نہیں لیکن یہ تو شاعر کا اندازِ نظر ہے۔ آپ کی رائے کیا ہے ؟

ج : میں نے یہ نظم اس وقت کہی جب میں ڈسٹرکٹ کونسل میں کلرک تھا۔ اس میں معاشی کا مسئلہ ہے جو شہروں اور دیہاتوں میں بھی ہے۔ اس نظم

میں تو وہی کچھ ہے جو آدمی اپنی زندگی بسر کرنے کے لئے کرتا ہے۔

س : جب آپ نے شعر کہنے شروع کئے تو اپنے سینئر شاعروں میں سے کس سے متاثر ہوتے ؟

ج : اس زمانے میں جوش کا پرچہ "کلیم" نکلتا تھا۔ اس میں میری ایک نظم چھپی تھی جو شبِ رفتہ کی پہلی نظم ہے۔ اس کے بعد ۱۹۴۰ء میں ایک نظم "ساقی" چھپی۔ اس زمانے میں میں جھنگ میں تھا۔ میرا دنیائے شاعری سے زیادہ ربط نہ تھا۔

س : میرا اندازہ ہے کہ آپ جوش سے قطعی متاثر نہیں۔

ج : قطعی نہیں۔

س : کچھ اور لوگ اس زمانے میں چھپ رہے تھے۔ مثلاً حفیظ وغیرہ۔ ان کی نظمیں آپ کی نظر سے گزری تھیں۔

ج : بہت کم۔

س : معاصرین بھی جو لوگ آپ کے ہم عمر تھے۔ ان کا کلام آپ نے پڑھا تھا؟

ج : یوسف ظفر، قیوم نظر، میراجی کے پرچے "ادبی دنیا" میں میری کچھ نظمیں چھپی ہیں۔ "خودکشی" وغیرہ میراجی کے زمانۂ ادارت میں چھپی۔ میں پنجاب کے شاعرانہ ماحول ہی کو بہت کچھ سمجھتا تھا۔

س : جن لوگوں نے آپ کے بعد لکھنا شروع کیا مگر جنہیں نظم نگار کے طور پر

بکھ نقاد اہمیت دیتے ہیں مثلاً اختر الایمان۔ ان کے کلام سے آپ کب متعارف ہوتے ؟

ج : اختر الایمان کا کلام اس وقت "خیال" بمبئی میں چھپتا تھا جو اختر الایمان اور میراجی نے نکالا تھا، ورنہ مجھے ان کا کلام بہت کم دیکھنے کا اتفاق ہوا بعد میں ان کی کتابیں پڑھیں۔ ان کا اسلوب بعض نظموں میں بہت اچھا ہے مگر وہ میری طبیعت کے مطابق نہیں ہے۔ سوائے چند نظموں کے مثلاً بچہ۔

س : اس وقت اردو میں دو بڑے نظم نگار سمجھے جاتے ہیں ایک فیض ہیں جو (CRAZE) بن گئے ہیں۔ دوسرے راشد ہیں۔ یہ دونوں آپ کے معاصر ہیں۔ ان سے آپ متاثر ہوتے یا ان کا کلام اسی وقت آپ کی نظر سے گزرا ؟

ج : فیض صاحب کے کلام سے اس وقت متعارف ہوا جب میں اسلامیہ کالج میں پڑھتا تھا۔ وہ گورنمنٹ کالج میں ایم۔ اے کر رہے تھے۔ اسی زمانے میں راشد بھی گورنمنٹ کالج میں پڑھتے تھے۔ اس زمانے میں جہاں تک مجھے خیال پڑتا ہے، فیض صاحب کی نظمیں" مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ" اور "سو رہی ہے گھنے درختوں پر چاندنی کی تھکی ہوئی آواز" بڑی مقبول تھیں۔ اسی طرح راشد صاحب اس

زمانے میں پابند کہتے تھے :ـــ

شگفتہ و شادماں رہے گی　　　میری محبت جواں رہے گی

بعد میں جب یہ خود ادبی دنیا کے ایڈیٹر رہے ان کا کلام دیکھا ہے۔ لیکن میں اس وقت فری ورس (FREE VERSE) کے اسلوب کو پسند نہیں کرتا تھا۔

س : رومانی نظمیں جن کے آپ نے حوالے دیتے۔ اس زمانے کے بیشتر شعراء کا آغاز انہیں نغموں سے ہوا۔ آپ کی ابتدائی نظمیں بھی رومانی ہیں۔ آپ نے اپنی رومانی نظموں اور ان شعراء کے ہاں کچھ فرق محسوس کیا ہے؟

ج : اس زمانے میں رومان سے مراد اختر شیرانی تھے اور قطعات اور سانیٹ وغیرہ بھی لکھے جا رہے تھے۔ اس زمانے میں اسی رنگ کا غلبہ تھا۔ لیکن آپ میری ابتدائی نظموں میں اس رنگ سے تفاوت دیکھیں گے۔ میری نظموں میں (PATTERN) مختلف ہے جیسے اس زمانے کی نظم "ساقی" ہے۔ جو مضمون کے لحاظ سے بالکل مختلف ہے۔ ان کو رومانی نظم اس لئے کہہ دیں کہ جوانی کے زمانے کی نظمیں ہیں جن میں انسان اثر قبول کرتا ہے۔

س : آپ کو کون کون سے کلاسیکل شعراء پسند ہیں؟

ج : میں نے مولانا ظفر علی خاں کا کلام بہت پڑھا ہے۔ میں ان کے کلام کا

قائل ہوں۔ مجھے اس وقت بھی ان کا بہت سا کلام یاد ہے۔ میں ان کے اسلوب بیان اور انداز کا بڑا معتقد ہوں۔ بعض کتابیں جو اس زمانے میں طبع ہوتی تھیں۔ جس میں قدیم اردو نظمیں جمع کی گئی تھیں۔ ان سے مسحور رہوا۔ مثلاً مناظر فطرت وغیرہ کے عنوان سے گلاب سنگھ اور عطر کپور وغیرہ نے جو مجموعے چھاپے انہوں نے میری رہنمائی کی۔ میرے لئے یہ نئی باتیں تھیں کہ جب دلی اور لکھنؤ میں امیر مینائی۔ داغ وغیرہ کے شاگرد غزل کہہ رہے تھے تو انہیں کے ہم عصروں میں بعض لوگوں نے نظمیں بھی کہیں۔

س: آپ ایک زمانے میں انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کرتے رہے ہیں۔ آپ کن انگریزی شاعروں سے متاثر ہوتے ہیں؟

ج: یہ ترجمے میں نے بہت بعد میں کئے ہیں جب "شب رفتہ" چھپ چکی تھی۔ لیکن سب سے پہلا ترجمہ میں نے آسکر وائلڈ کے (SERANADE) کا کیا۔ میں نے کیٹس اور شیلے کا بہت مطالعہ کیا ہے۔ انگریزی کے کلاسیکل شعرا کو بھی پڑھا ہے۔ لیکن KEATS اور شیلے کا زیادہ مداح رہا ہوں۔

س: آپ نے چند امریکن شاعروں کا بھی ترجمہ کیا تھا؟

ج: وہ ماڈرن شاعر تھے۔ ایک کتاب چھپی تھی، اس میں ماڈرن شعرا

نظمیں تھیں۔ بہت اچھی نظمیں تھیں۔ میں نے وہ کتاب پڑھی۔ کافی عرصے کی بات ہے، بارہ سال ہوگئے ہیں۔ میں نے ان کا ترجمہ کیا لیکن ان میں جو روانی اور "EX.ACTNESS" تھی۔ میری پابند نظموں میں نہ آسکی مثلاً اس میں ایک لائن تھی "SUN TOLD NEVER OLD EVER GOLD DAYS" لیکن میں اس لائن کا ترجمہ نہیں کرسکا۔ حالانکہ اسی لائن کے لئے ترجمہ شروع کیا تھا۔

س: آپ کے ہاں لفظوں کی تکرار بہت ہے۔ آوازوں سے آپ معنویت پیدا کرتے ہیں۔ یہ آپ کی دریافت تھی یا کسی شاعر نے اس طرف رہنمائی کی؟

ج: مجھے ایک دفعہ سوئن برن کی نظمیں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اس سے متاثر ہوکر کچھ چیزیں مجھ میں آگئیں۔

س: چھوٹی بڑی لائنوں کا آپ کے ہاں واضح مفہوم ہے مثلاً ہم سفر میں چھوٹی لائن منظر کی لمحاتی کیفیت ظاہر کرتی ہے اور لمبی لائن فضا کی وسعت اور دوری کا تصور دلاتی ہے۔ یہ آپ کے ذاتی تجربات ہیں؟

ج: نظم کی تخلیق کے گیان میں یہ ساری چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ نئے شعر میں یہ چیز (REPEAT) ہوتی ہے۔ نئے (TREND) میں یہ انداز ہے۔

س: میں آپ کی نظمیں جب پڑھتا ہوں تو مجھے معنویت کی مختلف تہوں کا

احساس ہوتا ہے۔ مگر میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ان کی قدر و قیمت کے مطابق ان کی تعریف نہیں ہوتی۔ کیا آپ اپنی تنقید و تحسین سے مطمئن ہیں؟

ج: میرے لئے یہ کہنا بڑا مشکل ہے۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے، اگر آدمی کا ربط دوسروں سے رہے۔ مجھے ایسے موقعے بہت کم ملے ہیں۔

س: آپ پر چند مضامین لکھے گئے ہیں مثلاً ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وزیر آغا، مظفر علی سید۔ کیا آپ اس مقام سے مطمئن ہیں جو نقادوں نے آپ کو دیا ہے کیونکہ میں اس سے مطمئن نہیں۔

ج: میں تو کچھ کہہ نہیں سکتا۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ میرے کلام کو لوگوں نے سراہا ہے اور پسند کیا ہے۔

س: آپ کی نظموں میں بے حد انفرادیت ہے۔ میں آپ کی نظموں کی دو یا چار لائنیں پڑھ کر پہچان سکتا ہوں۔ آپ کو اس انفرادیت کے مطابق مقام نہیں ملا۔ حالانکہ یہاں بیشتر شاعروں کی ان کی حیثیت سے بڑھ کر تعریف ہوتی ہے۔ ناموں کو جانے دیجئے۔ لطیفہ یہ ہے کہ آپ کو بعض لوگ نیا لکھنے والا سمجھتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ مرکز سے دور رہے ہیں۔ کیا یہ نقادوں کا فرض نہیں کہ چھوٹے اور بڑے شہر سے قطع نظر شاعر کا مقام متعین کریں۔؟

ج : صحیح ہے آپ کی بات ۔

س : جہاں تک مجھے یاد ہے شب رفتہ ۱۹۵۸ء میں چھپی تھی۔ اس کے بعد آپ کی بے شمار نظمیں چھپ چکی ہیں۔ اس کے بعد آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کی تفصیل بتا دیجئے ۔

ج : شب رفتہ میرا (SELECTION) تھا۔ اسے مرتب کرتے وقت میں نے بہت سی نظمیں نکال دیں۔ کم از کم شب رفتہ جتنی ضخامت کی نظمیں خارج کیں، اس کے بعد میں نے بہت نظمیں کہیں۔ ۱۹۶۲،۶۳ء میں میں نے "میونخ" اور "مرگ صدا" اور بہت سی نظمیں لکھیں۔ ۶۷، ۱۹۶۶ء میں شب رفتہ کے مزاج سے ہٹ کر نظمیں کہی ہیں۔ ان سے ایک ایک مجموعہ مرتب کیا جا سکتا ہے ۔

س : اب جو نظمیں آپ لکھ رہے ہیں وہ آپ کی پرانی نظموں سے بہت مختلف ہیں۔ آپ بتانا پسند کریں گے کہ آپ ان میں کیا تجربہ کر رہے ہیں ؟

ج : جو نظمیں میں پچھلے چار سال سے کہہ رہا ہوں تقریباً بالکل (FREE VERSE) میں ہیں، وہ ساری نظمیں ایک ہی بحر میں میں نے کہی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں زیادہ سہولت کے ساتھ اس بحر میں کہہ سکتا ہوں۔ اس کی شکل ایسی ہے کہ اس بحر میں فعلن فعلن، فعل فعولن، فاعلن اور مفاعلاتن سارے رکن لگ سکتے ہیں۔ اس کے باوجود میں نے کوشش

کی ہے کہ اگر ایک نظم میں ایک لائن پر زحاف آتا ہے تو ہر لائن زحاف پر ختم ہو۔ کہیں ایسا نہیں بھی ہو سکا۔ اگر ایک نظم میں ایک لائن سالم رکن پر ختم ہوتی تو تمام لائنوں میں سالم رکن آتے ہیں۔ سوائے ضرورت کے۔ یہ میری نظمیں چار سال میں آتی ہیں۔ ان برسوں میں یہ وزن مجھ پر حاوی رہا ہے۔

س: کیا آپ اردو کے عروض سے نامطمئن ہیں؟

ج: نہیں، البتہ جن بحروں میں مَیں پہلے لکھتا تھا وہ بہت معروف ہیں۔ پڑھنے والا انہیں روانی سے پڑھ سکتا ہے۔ میری نظم کا روانی سے تاثر کم ہو جاتا ہے۔ ان نظموں کے مضمون کا تقاضا ہے کہ پڑھنے والا رک کر پڑھے گا تو میری نظم کو "ENJOY" کر سکے گا اور اگر رواں پڑھے گا تو وہ اسے MISS کرے گا جس پر میں (INSIST) کرتا ہوں۔ مثلاً کب کے مٹی کی نیندوں میں سو بھی چکے ہو، میری نیندوں میں اسے جاگنے والے"۔ اس قسم کی لائن کو جب تک پڑھنے والا فعلن فعلن پر رک کر نہیں پڑھے گا، اسے بالکل نثر نظر آتے گی۔ اور وہ نثر کے ذریعے بھی پڑھ سکتا ہے۔ اور جب وہ نثر کے ذریعے پڑھے گا تو رک کر پڑھے گا اور وزن کے بہاؤ میں نہیں بہ جائے گا۔ اسی قسم کی نظمیں میں نے ۱۹۷۰ء، ۷۱ء میں کہی ہیں۔ ان میں سے کچھ نظمیں چھپ

چکی ہیں۔ بہت سی غیر مطبوعہ ہیں۔

س : میں شاعر تو نہیں ہوں لیکن اوزان سے دلچسپی ہے۔ اس لئے یہ کہہ سکتا ہوں کہ اردو میں مصرعے نثری ترتیب سے اس قدر ہٹے ہوتے ہیں کہ خیال میں قطع و برید کرنی پڑتی ہے اور منظوم کرنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ یہ وزن جو آپ نے اب اختیار کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ نثر سے قریب ہے۔

ج : اس کی وجہ یہ ہے کہ مسئلہ اور مروّجہ بحروں میں کہوں گا تو وہ اتنی (PRONOUNCED) ہیں کہ میرا ذہن ان کی طرف متوجہ رہے گا۔ میں اپنے خیال کو غیر شعوری طور پر اس بحر میں کہہ جاتا ہوں اور جب گنتا ہوں تو رکن پورا ہوتا ہے اور میرا فقرہ میرا اظہار اس پر حاوی ہوتا ہے۔ حالانکہ مجھے اس کا علم نہیں ہوتا۔ یہ آہنگ شعور کے ساتھ ہم عنان ہو جاتا ہے اور لکھنے والا آسانی سے لکھ لیتا ہے۔ اس کی یہ کیفیت جب سے معلوم ہوتی ہے۔ میں اسی میں مسلسل کہتا ہوں۔

س : آپ نے نثر بھی لکھی ہے۔ اپنے نثری مضامین کی تفصیل بتا دیجئے۔ آپ نے نثر کم لکھی ہے کیا اس میں دقت ہوتی ہے۔

ج : اخبار "عروج" جھنگ میں میں دس سال رہا۔ اس میں تقریباً سوائے محکمانہ صفحات کے سارا پرچہ میرا لکھا ہوا ہوتا تھا۔ مجھے وہاں نثر

لکھنے کی بہت ساری مشق ہوتی۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں انقلاب اور زمیندار میں مہر، سالک، حسرت کے کالم پڑھتا تھا۔ میں حیران ہوتا تھا کہ یہ لوگ روز کس طرح لکھ لیتے ہیں اور متواتر کچھ عرصہ میں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ میرے پاس ایک رجسٹر تھا۔ اس پر میں نے لکھا تھا۔ "از کاروان باشی" یہ ترکیب الہلال میں آزاد کی تھی۔ افکار و حوادث کی ترکیب بھی مولانا آزاد کی تھی۔ میں اسی طرح روزانہ بہت سارا عرصہ اس پر مشق کرتا رہا۔ پھر میں نے وکٹر ہیوگو کے ناول (AMSERABLE) کا ترجمہ کیا۔ جو کہیں چھپا نہیں۔ اس کے ترجمے پر میں نے بے حد محنت کی تھی۔ اس سے مجھے نثر کی مشق ہوتی۔ افسوس وہ مسودہ گم ہوگیا۔

(یہ انٹرویو ۱۹۷۲ء میں لیا گیا)

شیر افضل جعفری

مجید امجد — کوی سدھارتھ

گیان دھیان کا راجا، سُدھ سوچ کا راٹھ، سدا بن باسی، دو دوان سادھو سمندروں ڈونگھا، پہاڑوں اُچا، سوتیوں کھرا، موتیوں سچّا، چیبتا بلار، گامن سچیار، کل مکلّا، تنہا تنہا، تن کا ردگی، من کا بھوگی، فن کا جوگی، نت کا سوگی، جھنگ کا بالا، ساہیوال کا متوالا، ست پال، ادب ابدال، دوجا اقبال، نثر کی شان، نظم کی جان، غزل کا ایمان، قلم کا سلطان، قرطاس کا شاہجہان، فرقت مآب، الم انتساب، غم جناب، امجد :

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

میں ان دنوں دوآبہ چج میں بہشت وچیھناں کے سنگھم زموں سے ذرا دور اتر پار جیلانیوں کے باغ میں بھاگی بھادوں کے مستوار، نچیار، پھوار میں پرچ رہا تھا، خبر ملی کہ ضلع کے صاحب نے مجھے ست وادہ "عروج" کا مدیر مقرر کیا ہے۔ کملی جوانی کا زمانہ تھا، دل کی بادشاہی کے دن تھے۔ اتنا سنتے ہی پھول کر شیخ چلی ہوگیا اور لگا خیالی پلاؤ کے چاول محل اسارنے۔ لیکن بیس دن

بیت جانے پر بھی جب ادارت کا آرڈر نہ ملا تو زچ ہو کر بھاگم بھاگ جھنگ
پہنچا۔ پتہ لگا کہ یہاں تو کسی مجید امجد کی تعیناتی ہو چکی ہے۔ دل پر یم برس گیا۔
جل بھُن کر انتقام کی ٹھان لی کچھ بھڑتے بھتے ساتھ لئے اور اخبار کے دفتر میں
جا گھسا۔ وہاں ایک لانبا لانجا، جوان جہان، الہ دمی امان عروج کے مچان
پر براجمان تھا۔ میں نے اوچھے پن کی طرح ڈالی۔ وہ شخص طرح دے گیا۔ دوبارہ
تلخی پیدا کرنی چاہی تو اس کے مصرعے جواب نے میرے کانوں میں رس گھول
دیا۔ پھر چھیڑا تو اس کے لبوں پہ ایک معصوم مسکراہٹ مچل گئی اور میں
بے لڑے ہی شکست کھا کر رہ گیا۔ یہ تھا میری اور مجید امجد کی سنگت کا
دھوپ چھاؤں آغاز۔ محبت کے ریشم کی گرہ کچھ اتنی پیچ گئی کہ پھر ہم دونوں
جیتے جی انجرانج نہ ہو سکے۔ وفاداری بشرط استواری جزو ایمان ہوتی چلی
گئی۔ ع؎

بڑا مزہ اس ملاپ میں تھا

ساندل بار کی بستی سپراواں کے ایک سرکاری جلسہ کے موقع پر میری
جھنگ رنگ تقریر سن کر اس وقت کے ڈپٹی کمشنر نے مجھے کپلسری ایجوکیشن
افسر بنادیا اور میں چک نولاں سے جھنگ صدر آگیا۔ اب میرے دفتری
وقت کی دو تہائیاں دفتر عروج میں بسر ہونے لگیں اور یوں ایک آدھا
کملا اور ایک پورا سیانا۔ من تو شدم تو من شدی کے مصداق دودھ پتاشہ۔

ہوگئے۔

نواب سرفراز خاں مرحوم، کرنل سکندر علی حاتی، چودھری شیر محمد شعری لالہ امرناتھ سہگل اور یہ غریب غنی ان دنوں پنج بھیئے کہلاتے تھے۔ بکری بھکوں علی اکٹھوں، شعری چوکیوں کے ساتھ راگ رس اور جناب رنگ کے پروگرام بھی چلتے رہے۔ خورشید نام کی ایک آتشیں نفس مغنیہ کا چرچا ہوا۔ ذوقِ نظر کی تسکین کے لئے رقصاں و جولاں اس بازار میں جا پہنچے۔ غالب کی پھڑکتی ہوئی غزلیں سُن کر دل وایمان دے بیٹھے۔ سرفراز خاں کی دریادلی نے اس شب تو ہم سب کا بھرم رکھ لیا۔ مگر پھر جو اک روز موج آئی تو بے سوچے سمجھے پروانہ وار ادھر اُدھر آ پڑے۔ چند قدم پر تہی دستی کے احساس نے راستہ روک لیا۔ اس مشکل کے حل کی تجویز فوراً ذہن میں دُمک اُٹھی۔ وہیں شناساؤں سے لائبریری کی تعمیر کے نام پر چندہ مانگنا شروع کر دیا۔ پاتے گدا لنگ نیست ۔ ملکِ خدا تنگ نیست ۔ قطرہ قطرہ بسیلے ، اندک اندک خیلے ، تھوڑے ہی وقت میں ہماری نیک نیتی رنگ لے آئی ۔ چالیس روپے بارہ آنے جمع ہو گئے اور ہم تہی کیسانِ شہ مزاج جھومتے جھامتے رامش گہ میں جادھمکے۔ وہاں خورشید سے دو دونوں کان بھر کر غالب سنا۔ برگ ہائے سبز تحفۂ درویشاں کے طور پر نذر کئے اور خالی ہاتھ اُٹھ کر چلے آئے۔

ع، اِک ــــــ وہ بھی زمانہ تھا

مسافروں کی آدھی یا دھی ملاحوں کی بستی کے پاس ستی پتن پر سرفراز خاں اپنی غزل پال، جواں سال اور اندرچال ٹولی کو لے کر چنھاں کنارے بھرپور مخمور قسم کا موج میلہ جایا کرتے تھے۔ گانے والیاں ساتھ ہوا کرتی تھیں۔ روح انگور اور ساوی کے لال گلال اور ہرے بھرے جام چڑھائے جاتے تھے۔ پھر گھڑے لے کر سب مے بوٹے رنگے سینے سے نیچے تک رہتے ہوتے پانی میں اتر جاتے اور سُہرلی کا نگین سنگیت کی صورت میں "لنگھ آجا پتن چنھاں دا او یار لنگھ آجا پتن چنھاں دا" کچھ اس دلبری سے الاپتیں کہ ایک مست سماں بندھ جاتا۔ راگ بھری کڑیوں چڑیوں کی ٹکڑی پیچ میں ہوتی۔ اور سننے والے متوالے ان کے گرد ہالہ باندھ لیتے۔ تالیاں بجتیں، داد کے ڈونگرے برستے اور جھاوٹ پہ جوانی آجاتی۔ جید امجد ایسے میں پریوں کے مولا ناچ کا نشے وَر گا مزہ لیتے۔ پھر وہیں دریائی مشاعرہ شروع ہو جاتا۔ اس کھارے کے دولہا مجید امجد ہوا کرتے تھے۔ غزل پہ غزل، نظم پہ نظم اور گیت پہ گیت برساتے چلے جاتے۔ سننے والے ان کی سدا سہاگ چیزوں پر سر دھنتے، دل وارتے اور روحیں بھینٹ چڑھاتے۔ بھتی دیگر کو یہ دھوم چوکڑی مدھم ہو جاتی اور ہم لوگ ہنستے کھولتے شام تک جھنگ پہنچ جاتے: ع

یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا۔

میں نے بیٹھک اٹھک کے لئے ایک الگ مکان کرائے پر لے رکھا تھا جہاں دن بھر سیاست چلتی تھی۔ ایک روز گرما گرم دوپہر کو مجید امجد معروف مغنیہ خورشید کو ساتھ لئے میری احباب گاہ میں اچانک آ گئے۔ میں یہ منظر دیکھ کر دل ہی دل میں شرمایا، گھبرایا اور سٹپٹایا۔ لیکن ایسے نازک وقت میں "جی آیاں نوں" کہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ چھلّی ڈیڑھ چھلّی کی دیر خوش گپیاں ہوئیں اور وہ خورشید سمیت چلے گئے۔ ان کے جانے کے فوراً بعد محلّہ والوں کا ایک ہجوم امڈ آیا۔ شکایت کی کہ انہیں مجھ سے اس رنگین حرکت کی امید نہ تھی۔ میرے ذہن رسا نے میرا ساتھ دیا اور میں نے جھٹ کہا، کیسی حرکت؟ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ بولے ایک تن فروش کو یہاں کیوں بلوایا۔ میں نے ماتھے پر ہاتھ مارا اور تنک کر کہا، افسوس ہے، آپ اتا پتا کئے بغیر ہی میری توہین پر تل گئے ہیں۔ بھائی صاحبان، آپ مجید امجد کو تو جانتے ہیں۔ ہمارے ضلع کے سر پنچے سپوت، شاہین شاعر اور دبنگ دانشور ہیں۔ انہوں نے حال ہی میں ایک سولہ پاس لڑکی سے شادی رچائی ہے۔ خاتون بہت زیادہ پڑھی لکھی ہونے کے باعث پردہ نہیں کرتیں۔ میاں بیوی آج مجھ سے ملنے آتے تھے۔ میرا یہ کہنا تھا کہ بھیڑ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ شاکی بے حد پشیمان ہوئے۔ گستاخی کی معافی چاہی اور چلتے بنے۔

ع : لغزشیں حسن آدمیت ہیں

مجید امجد ایک سادہ اور علیم گھرانے کی آنکھوں کے قطب تارے تھے ان کے نانا بزرگوار کو طب، عربی اور فارسی پر پوری قدرت حاصل تھی۔ ان کے ماموں منظور علی خوؔف کو استادِ شہر کا مقام میسر تھا۔ خان بہادر یوسف شاہ بیرسٹر ان کے مداح و مخلص تھے۔ ہم نے پہلی ادبی انجمن ترتیب دی تو اجلاس موصوف کے بنگلہ پر ہوا کرتے تھے۔ زبان و ادب کو حسن و جوانی عطا کرنے کے لئے مجید امجد نے وقتاً فوقتاً کئی ادارے بنائے۔ کچھ عرصہ مذاکرات مباحثات کا دور دورہ رہا۔ افسانوں کی رات رانیاں مناتی جاتی رہیں۔ غزلوں کی سہاگن شامیں تو اودھ کی سانولی سلونی سندیاوں کو مات کر دیا کرتی تھیں۔

کسی کو رنج پہنچانا مجید امجد کے بس کی بات نہ تھی اور کوئی ان سے خوشامد کی امید بھی نہیں کر سکتا تھا۔ چپ گھبیرتا اور برداشت کے بادشاہ تھے۔ اپنا مفہوم چند نپے تلے جملوں میں ادا کرنے پر قادر تھے۔ قہقہہ سے امکان کی حد تک اجتناب کرتے۔ مسکراہٹ کی دانشمندانہ جھلک پر ہی اکتفا کر لیتے۔ نہ کنجوس تھے نہ فضول خرچ۔ خود ستائی اور خود نمائی سے نفرت تھی۔ آواز میں مردانہ کرارا پن تھا۔ شاعروں میں عظمت سے پڑھا کرتے تھے۔ کسی کمتر شاعر کو حقارت سے دیکھنا ان کے لئے دُور کی بات تھی۔ کوئی بوگس شخصیت انہیں متاثر نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اندوہ کے دھنی تھے۔

ان کے درد و غم سے خوشبوئیں پھوٹا کرتی تھیں۔

میری تمنا پر میرے مجموعۂ کلام "ساڈے من بھائوندے" کا ابتدائیہ لکھ کر مٹی کے دیئے کو دو سو کینڈل پاور کا بلب بنا دیا۔ اس کے لئے مرحوم نے کئی کتابیں خرید کر پڑھیں اور پھر اس دلبرانہ انداز سے قلم اٹھایا کہ ان کے حرفِ اوّل کی برکت سے میری کتاب کے یکے بعد دیگرے تین ایڈیشن چھپ کر ہاتھوں ہاتھ بک گئے۔ میں اس عنایت کا شکریہ ادا کرنے کے لئے ان کے حق میں دعا سنج رہتا ہوں۔

دوسری عالمگیر جنگ چھڑی تو ململ نایاب سی ہوگئی۔ انہیں معلوم تھا کہ میں مردِ طرّہ طراز ہوں۔ میری وضع داری کی لاج رکھنے کے لئے وہ گھڑی کی سوئیوں کی باقاعدگی کے ساتھ ہر چوتھے مہینے باریک ململ کی پگڑی لاکر دے جایا کرتے تھے۔

سن چھیالیس کا انتخاب ہوا تو یونینسٹوں نے غیر مسلموں سے مل کر وزارت بنائی۔ مسلم لیگ والوں نے ایجی ٹیشن کا ڈول ڈال دیا۔ جھنگ میں سرکاری ملازم ہونے کے باوجود جن سر پھروں نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ ان میں یہ فقیر پُر تقصیر بھی شامل تھا۔ پولیس کے کانوں میں کسی نے یہ بھنک ڈال دی کہ سِول نافرمانی کی مہم کو درپردہ ایک شاعر چلا رہا ہے۔ انہوں نے کسی شخص سے جھنگ کے بڑے شاعر کا نام دریافت

کیا تو بتانے والے نے کہا۔ مجید امجد۔ بس پھر سکورٹی سٹاف کی ڈائریاں مجید امجد کے خلاف جانے لگیں۔ اوپر سے مجید امجد ہی کے خلاف کارروائی کرنے کے احکامات جاری ہوتے رہے۔ اب مجید امجد جھنگ میں موجود ہوتا تو اس کے خلاف ایکشن لیا جاتا۔ وہ تو ملازمت کے سلسلے میں ضلع سے باہر مقیم تھے۔ لہٰذا مرحوم کے خلاف کوئی اقدام کارگر نہ ہو سکا اور میں مجید امجد کی اوٹ میں گرفتار ہونے سے محفوظ رہا۔ لوگ تحریک میں میرے پیش پیش رہنے کے باوجود نہ پکڑے جانے پر حیران تھے اور میں خود بھی اس راز کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ لیگ وزارت بن جانے کے بعد پتہ چلا کہ اس مرحلہ پر بھی مجید امجد میرے محافظ رہے۔

مجید امجد کو شادی خانہ آبادی کے باوجود دل کی ویرانی سے جو غم نصیب ہوا، اس کی دین سے ان کی شاعری جھلسیے سوز اور جلتے بجھتے فلسفہ میں ڈھل کر زندۂ جاوید ہو گئی۔ وہ باوقار قنوطیت کے امام تھے۔ مجید امجد کی یاسیت کو فن کی ترسیل (شبنم) نے گل دوپہر بنا دیا تھا۔ بیسویں صدی کے سدھارتھ کو ہی نے سوچ، سدھا و سرور کے تال میل سے اردو زبان کو نظم و غزل کا چمن عطا کیا جس کے پھولوں سے رہتی دنیا تک "اگر بتیوں" کا نکہت بکش دُھواں اٹھتا رہے گا۔ مجید امجد کے شاعرانہ لہجے نے ملہار، چندر کونس اور آگ راگ کے ٹھاٹھ الاپ میں گھل مل کر ٹھنڈی میٹھی تپش در

چمک کا برن دھار لیا ہے اور یہی ان کے مزاجِ سخن کا طرہ چنار ہے۔ میں نے شب رفتہ اور "شب رفتہ کے بعد" کے بعد سے زیادہ ان صحیفوں کے خالق کو پڑھا پرکھا ہے۔ ان دونوں کتابوں کے مطالعہ سے زیادہ نور و سرور مجید امجد کے قرب سے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ یہ تصانیف تو گنگ و صامت ہیں اور مجید امجد بیاضِ ناطق تھے۔ چہکتی ہوئی کتاب۔

مجید امجد اپنی عمر کے آخری برسوں میں صرف ساہیوال اور جوگی جی کے ہو کر رہ گئے تھے۔ انہیں جھنگوچیوں سے زیادہ ساہیولیوں سے محبت تھی۔

مجید امجد مرنے سے کچھ عرصہ پہلے ایک دن قیامت کا جھاڑا جھیل کر نو بجے صبح اچانک میرے جھونپڑے میں طلوع ہوتے۔ چہرے پر افسردگی کا گہن چھایا ہوا تھا۔ بالوں سے پریشانی اُلجھ رہی تھی۔ کوٹ پتلون نے ملگجاہٹ کو اپنا رکھا تھا۔ میں چیونٹی کے گھر میں نارائن کو اس حال میں دیکھتے ہی ملول و مغموم ہو کر اٹھا۔ گلے ملا۔ ہاتھ چومے۔ پیشانی کو بوسہ دیا۔ کرسی پر بٹھایا۔ خیریت پوچھی۔ بلائیں لیں۔ چائے پلائی۔ سگریٹ پیش کئے۔ پوچھا اتنی سردی میں کیوں تکلیف کی، مجھے بلوا لیا ہوتا۔ میں پہنچ جاتا۔ میری مونچھ کو محسوس کر کے مسکرا دیتے۔ فرمایا، اور آگیا تھا۔ دل کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جانے پر بے تحاشا آگیا ہوں۔ میں نے کہا، امجد بھائی! آپ مائل بہ غزل کیوں نہیں ہوتے۔ کہنے لگے، افضل صاحب! آپ سمجھتے ہیں کہ میں تغزّل سے دور ہو گیا

ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ لو سنو میری تازہ غزلیں۔ متواتر آٹھ سسکتی ہوئی غزلیں عطا کر کے مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ تھوڑی دیر چپ رہے اور پھر کرب و اندوہ سے مملو آواز میں کہا، افضل جی! ناصر شہزاد نے مدت سے شکل ہی نہیں دکھائی۔ خدا جانے وہ کہاں رہتا ہے۔ پھر بولے، لوگ کہتے ہیں، مجید امجد بے بحری نظمیں لکھتا ہے۔ حالانکہ میری ہر چیز ایک ہی بحر فعلن فعلن فعلن وغیرہ کے ترازو میں تلی ہوتی ہوتی ہے۔ آدھ پون گھنٹہ درد و غم کے پھول بکھیرے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے تانگہ سٹینڈ تک ساتھ دیا اور واپس آ کر ان کی خستگی اور پژمردگی کو تصور میں لا کر رم جھم رم جھم روتا رہا۔

آخری بار وہ ایک مقدمہ کی پیروی کے سلسلہ میں بادلِ ناخواستہ جھنگ گئے۔ آٹھ دس دن تک بے چھاؤں راہوں پر ظالم دھوپ میں پیدل چلتے رہنے کے باعث تکلیف بڑھ گئی۔ دردِ شش نے ان پر جینا کٹھن کر دیا۔ انہیں یقین تھا کہ موت کا دن ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ کی دوری پر رہ گیا ہے۔ وہ دُکھ اور بے چارگی کے باوجود جھنگ سے ساہیوال پہنچے۔ انہوں نے کالے کوسوں کا سفر ساہیوال میں آ کر مرنے کے لئے گوارا کیا تھا۔ انہیں اس فضا سے وفا کی خوشبو آتی تھی۔ وہ ادھر کے احباب پر جان وار دینا چاہتے تھے۔ انہیں اس شہر میں دھوم سے جنازہ اُٹھنے کی امید تھی۔ وہ ساہیوال کے دل خیز مٹی میں دفن ہونے کی آرزو رکھتے تھے۔ لیکن وہ لوگ ان کے اس

ارمان کو بھانپ لینے سے قاصر رہے۔

ع، دل دریا سمندروں ڈونگے کون دِلاں دیاں جانے ہو

مجید امجد نے اپنی دُکھی جندڑی الہ موئے کے سپرد کی تو میت جھنگ بھجوا دی گئی۔ جہاں اب چند رشتہ داروں، کچھ ادیبوں، گنے چُنے صحافیوں، مٹھی بھر شاعروں کے سوا کوئی ان کا وارث ہی نہ تھا۔

میں شہید سفر کو وتنہائی کے ماتمی جلوس میں شامل ہونے کے لئے تیز گام ہوا تو لوگوں نے پوچھا، اتنا جلدی کہاں جا رہے ہو، میں نے کہا، مجید امجد کے جنازے میں شریک ہونے کے لئے۔ مجمع کے منہ سے نکلا کون، مجید امجد؟ یہ سُن کر میرے دل پر تیر لگا اور جگر کے پار ہو گیا۔ غالب ثانی کی لاش اٹھی تو موت کے بنبرے کی برات میں شامل ہونے والوں کی تعداد تیس پینتیس سے زیادہ نہ تھی۔ ہم اس نابغۂ روزگار کی اپنے وطن میں یہ بے پُرسی دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر روتے اور کئی دن تک روتے رہے۔

حدّتِ ایّام سے جلتا رہا   شعلۂ فریاد میں پلتا رہا

دِل کو انگارہ بنانے کے لئے   دھڑکنوں کو پنکھیاں جھلتا رہا

آسمانِ زندگی پر عمر بھر

روز سورج کی طرح ڈھلتا رہا

آہ وہ رنجورِ مقتولِ حیات   موت کے آغوش میں پلتا رہا

وہ زمینِ سیم کا مینار تھا　　دھیرے دھیرے دم بدم گلتا رہا
وہ ریاضِ دہر میں محرومِ گل　　اور زمانہ پھولتا پھلتا رہا
میں غریب جھنگ اس کے حال پر
ہاتھ رہ رہ کر سدا مَلتا رہا

بلال زبیری

شہید تنہائی

اس نے ایک ایک دُکھ سہا تنہا   انجمن انجمن رہا تنہا

مجید امجد کی وفات سے جدید شاعری کے فن، فکر و فلسفہ اور اک اُردو جدان کی پچاس سالہ تاریخ کا ایک باب مکمل ہوگیا۔ وہ انسان جس نے زندگی کے تمام دکھوں کو اس طرح تنہا برداشت کیا کہ اپنے جسم کو بھی شریک غم نہ ہونے دیا صرف اپنی روح میں ان کو سمویا، لیکن تابہ کے؟ بالآخر جسم بھی روح کا ہم سفر بن گیا۔

مجید امجد نازک احساسات کا مجموعہ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرن اول کے کسی انسانی قافلہ سے بچھڑ گئے تھے۔ اور بھٹکے ہوئے راہی کی طرح منزلیں قطع کرتے ہوتے اس جہنم زار معاشرہ میں آپہنچے تھے، جب تک پاؤں چلتے رہے، پاؤں کے چھلنی ہونے کا احساس نہ ہوا۔ جونہی اس معاشرہ میں پہنچے اپنے احساس کے زخموں کو زندہ پایا۔ ان کے زخمی احساس نے ان کی روح کے اردگرد خون کا ہالہ بنادیا۔ وہ زندگی بھر اپنے اس ہالے کو عبور کرنے کی فکر میں مصروف جہد رہے مگر ہمیشہ خود کو تنہا پایا۔

وہ تنہائی اور گوشہ نشینی سے اس قدر مانوس ہو چکے تھے کہ ان کے بھرے شہر اجاڑ نظر آتے تھے۔ وہ شہروں کے باغ و چمن کی نعمتوں کو نوحۂ مرگ جانتے تھے۔ وہ انجمنوں اور محفلوں سے خوف زدہ تھے۔ وہ اپنے زخمی اور اداس دل کا مداوا چاہتے تھے۔ لیکن جب بھی ان کے فکر نے اِدھر کا رُخ کیا احساس کے زخم اور گہرے ہوتے چلے گئے۔ پاک و شفاف دل پر احساس کے زخموں نے یوں داغ لگاتے جیسے دیوالی کے چراغ منڈیروں پر روشن ہوں اور مجید امجد انہی چراغوں کی روشنی سے کم وقت کی پگڈنڈیوں پر پھیلاتے رہے وہ پگڈنڈیاں جو انسانیت کی طرف جاتی ہیں۔ وہ راستے جو وجدان و عرفان کے گہواروں تک پہنچتے ہیں۔ لیکن جب بھی وہ روشنی لئے آگے بڑھتے، زمانہ کی روش ان کے پاؤں میں زنجیر ڈال دیتی۔ وہ ہاتھ پھیلانا چاہتے تو نئی تہذیب کی تلوار ان پر حملہ آور ہو جاتی۔ وہ بولنا چاہتے مگر وقت کی تعزیر زبان پر پہرہ بٹھا دیتی۔ وہ اشاروں کنایوں پر اپنا مقصد سمجھانے کی کوشش کرتے مگر لوگوں کے فکر و ادراک پر خود غرضی، لالچ اور مفادات کے پتھر برسنے لگتے غرض مجید امجد نے نصف صدی تک احساس کے چراغوں کو اپنے دل اور اپنی روح کے زخموں سے روشن کئے رکھا مگر جب بھی انہوں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا خود کو تنہا پایا۔

وہ کیوں نہ تنہائی سے محبت کرتے؟ وہ کیوں نہ گوشہ نشینی اپناتے؟

ان کا زندگی بھر کسی نے ساتھ نہ دیا اور اگر کسی نے وفا کی تو وہ صرف ان کی تنہائی تھی۔

وہ سوچ کے ان دریچوں کو بند رکھتے تھے جن سے رسوائی کے جھونکوں کا گزر ممکن تھا۔ وہ ان جھروکوں کو پتھروں سے پاٹ دیتے جن سے نئی تہذیب کے گندے جراثیم معاشرے میں عفونت پھیلا سکتے۔ جیدامجد کو احساس تھا کہ پھول اور کانٹوں کی سرشت جدا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ فطرت لم یزل نے صحن چمن کو ان دونوں سے مزین کیا ہے۔ مگر یہ بات ان کے فہم سے ہمیشہ ماورا رہی کہ کانٹوں کی سزا پھولوں کو کیوں؟

انھوں نے اپنی زندگی کی مسلسل اور تیز چبھن کے لئے مخصوص کئے رکھی تاکہ وہ پھولوں کو رسوائی سے بچا سکیں۔ وہ پھولوں کی نرم و نازک پتیوں پر ہر حرکی دراز دستی دیکھ کر تڑپ اٹھتے۔ وہ سوچتے کہ گلستان کے حسن کا یہ مآل کیوں؟ وہ صحن چمن کے کناروں پر گھومتے اور گلوں کی خوشبو سمیٹتے اس لئے نہیں کہ انہیں اس کی ضرورت تھی بلکہ اس لئے کہ خوشبو کا یہ ذخیرہ بکھر کر گناہوں کی خواب گاہوں کی زینت نہ بن جاتا۔ وہ پھول کو معصوم سمجھ کر اس کی عصمت کی حفاظت کرنا چاہتے تھے۔ وہ شہیدان چمن کے محافظ تھے۔

لیکن ان کی عملی زندگی ہمیشہ خوشبو سے خالی رہی۔ ان کا دامن کبھی پھولوں سے مزین نہ ہوسکا۔ ان کی روح کو کبھی چمن نے راحت نہ بخشی۔ ان

کی آنکھوں کو کسی پھلواڑی نے نورِ حیات عطا نہ کیا۔ ان کے دل کو کبھی سکون و قرار نہ ملا۔ وہ ساری عمر مضطرب و بے قرار رہے۔ انہوں نے دنیا والوں کو اندھیرے اُجالے کے فرق کا احساس دلایا۔ انہوں نے ظلم و جبر کے درمیان اپنی حسرتوں کے اینٹ گارے سے حدِ فاصل قائم کر کے اس پر جدید شاعری کا ایک قلعہ تعمیر کیا۔

انہوں نے تشنگی کے چشمے دوسروں کے لئے لٹائے مگر خود محروم رہے انہوں نے فکر و فلسفہ کے چراغ خونِ جگر سے روشن رکھے مگر دنیا پھر بھی اندھیروں میں بھٹکتی رہی۔

مجید امجد مرحوم شخصی محاسن، خصائص اور فضائل کے اعتبار سے اقبال کا مردِ مومن تھا۔ ان کی زبان سے، قلم سے، کردار سے گفتگو سے کوئی گھٹیا کام یا گھٹیا حرکت سرزد نہ ہوتی۔ وہ انتہائی وضعدار اور خوددار انسان تھے۔ ان کے کانوں نے کبھی چغلی نہیں سنی اور زبان نے کبھی غیبت نہیں کی۔ وہ دوسروں کے لئے زندہ رہے۔ وہ دوسروں کے لئے سوچتے رہے وہ صابر و شاکر تھے۔ وہ قانع تھے۔ انہوں نے دوسروں کا بوجھ اٹھایا۔ اپنا بوجھ کسی سے نہیں اٹھوایا۔ یہاں تک کہ حکومت نے پانچ سو روپیہ ماہانہ کے جس وظیفہ کا ان کے لئے چند ماہ قبل اعلان کیا تھا وہ رقم ان تک ابھی نہیں پہنچ پاتی تھی کہ وہ اس دنیا سے اٹھ گئے۔ وہ کسی کا احسان لینا ہی

نہیں چاہتے تھے۔

مجید امجد کو لڑکپن سے لے کر موت کی ہم آغوشی تک راقم الحروف نے قریب سے دیکھا۔ قریب سے مطالعہ کیا۔ ان میں خوبیاں ہی خوبیاں تھیں۔ وہ ایک با اصول، غیرت مند، منکسر مزاج اور وضعدار انسان تھے۔ دنیا کے ہر دکھ کو خندہ پیشانی سے قبول کیا اور کبھی دوسروں کو اپنے دُکھ کا احساس نہیں ہونے دیا۔ وہ انسانیت کی کھلی کتاب تھے۔ ان کا ضمیر پیچ و تابِ رازی اور سوز و سازِ رومی سے تیار ہوا تھا۔ ان کی روح اقبال کے مردِ مومن کی روح تھی۔ ان کی زندگی درویشی اور فاقہ مستی سے عبارت تھی۔ وہ اپنے دور کے عبقری تھے اور یہ خصوصیات ڈگریوں سے نہیں ملتیں اور نہ درسگاہوں سے میسر آتی ہیں بلکہ یہ عطیہ الٰہی ہیں۔ انہی خوبیوں سے انسانیت کی توقیر قائم ہے۔

مجید امجد بڑے شاعر تھے یا عظیم انسان مگر میں اب تک فیصلہ نہیں کر سکا کہ وہ شاعر بڑے تھے یا انسان۔ مرحوم کی ابتدائی زندگی کے ماہ و سال میرے سامنے یوں بکھرے پڑے ہیں جیسے کتاب کے اوراق۔ اور میں ماضی کی جھروکوں سے جھانک کر دیکھ رہا ہوں کہ مجید امجد منزل بہ منزل کس طرح قدم بڑھاتے جا رہے ہیں۔

یوں تو ہر شخص کی زندگی واقعات و حادثات سے مرتب ہوتی ہے۔ ان

میں کچھ گفتنی ہوتے ہیں اور کچھ ناگفتنی. مگر امجد کی زندگی کے تمام واقعات گفتنی ہیں اور ضخیم کتاب کے متقاضی. اس لئے یہاں ان کے خاندانی حالات اور مرحوم کے ذاتی واقعات مختصر طور پر عرض کروں گا تاکہ اہلِ علم ان کی ہمہ پہلو زندگی کا جائزہ لے سکیں. وہ اہلِ قلم جو ان کی زندگی میں ان کے لئے چند سطریں نہ لکھ سکے ۔ شاید اب وہ حق ادا کر سکیں۔

مجید امجد کا خاندان شروع ہی سے علم و فضل کا وارث چلا آرہا ہے: ان کے اجداد میں مولوی نور احمد اپنے زمانہ کے عالم تھے ۔ اسی علمی فضیلت کی وجہ سے جھنگ کے رؤسا اور والئ ریاست نے ان کو ۱۸۱۰ء میں چنیوٹ سے مستقل طور پر جھنگ میں آباد ہونے پر آمادہ کیا. موصوف اپنے شہر کے خطیب تھے. فقیہہ، امام عیدین رہے. پھر ان کے لڑکے میاں غلام قاسم بھٹی نے مسند سنبھالی. لیکن اس خاندان کے علم و فضل کی شہرت میاں غلام قاسم کے صاحبزادہ میاں نور محمد کی وجہ سے ہوئی. یہاں نور محمد کا انتقال ۹۰ برس کی عمر میں ۱۹۴۷ء میں ہوا. اپنے عہد کے بے مثال عالم، فقیہہ محدث اور ماہرِ طبیب تھے ۔ ان کے تلامذہ کی تعداد ہزاروں تک تھی. میاں نور محمد پہلے جامع مسجد کوٹ روڈ جھنگ صدر کے امام تھے. پھر جامع مسجد قطب الدین میں اس منصب پر فائز ہوئے اور زندگی کے آخری دنوں تک خدمتِ دین انجام دیتے رہے ۔ اپنے رہائشی مکان کا ایک حصہ مسجد

اور کتب کے لئے وقف کر دیا تھا۔ میاں نور محمد جناب مجید امجد کے نانا تھے۔
مجید امجد ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوتے۔ ان کے والد کا نام علی محمد تھا جو محکمہ
تعلیم میں ملازم تھے۔ ابھی امجد چھ ماہ کے تھے کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ یہ
مرحوم کی زندگی کا پہلا حادثہ تھا۔ اور پھر اسی حادثہ کی کرب ناکیوں میں
مجید امجد کی پرورش ہوتی۔ ابھی تین برس کے تھے کہ ان کے والد نے دوسری
شادی کر لی۔ اور سوتیلی ماں کے سوتیلے پن نے ان کو گھر کے پُرسکون ماحول
سے محروم کر دیا۔ چونکہ میاں نور محمد کو اپنی بیٹی سے بڑی محبت تھی اس لئے
انہوں نے اپنے نواسے کو اپنی گود میں لے لیا۔ اور پھر مجید اپنے نانا کے
علمی ماحول میں پروان چڑھا۔ میاں نور محمد نجوم، طب، حدیث و فقہ کے
ماہر تھے۔ روزانہ اہلِ علم کی مجلس برپا ہوتی تھی۔ مختلف مسائل زیر بحث آتے
مجید امجد ان محفلوں میں شامل ہوتے اور ذہنی بالیدگی حاصل کرتے۔ پانچ
سال کی عمر میں قرآن مجید، گلستان، بوستان، پند نامہ عطار پڑھ چکے تھے۔
پھر سکول میں داخل ہوتے۔ صبح سکول میں پڑھتے اور پچھلے پہر اپنے نانا
سے عربی فارسی، صرف و نحو پڑھا کرتے تھے ۱۹۲۹ء میں میٹرک پاس کیا
اس وقت تک دیوان حافظ، غالب، داغ، ذوق، میر کا مطالعہ مکمل کر
چکے تھے۔ طب اکبر، قانون اور جالینوس پر بھی عبور حاصل کر لیا تھا میٹرک
کے بعد ایف۔ اے گورنمنٹ کالج جھنگ سے کیا۔ بی۔ اے کی ڈگری

اسلامیہ کالج لاہور ۱۹۳۲ء سے حاصل کرنے کے بعد جھنگ آ گئے۔ سکول کے زمانے ہی سے شعر و شاعری کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ان کے ماموں میاں منظور علی خوف بڑے اچھے شاعر تھے اور اسلامیہ سکول میں ٹیچر تھے۔ ان کی وجہ سے سکول میں ادبی ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ ماموں اور بھانجا ایک ہی سٹیج پر شعر پڑھتے تھے۔

ان دنوں جھنگ میں محکمہ دیہات سدھار ایک اصلاحی تحریک چلا رہا تھا۔ امجد مرحوم اس محکمہ میں پبلیسٹی افسر تعینات ہوتے۔ یہ محکمہ عام موضوعات پر دیہات میں ڈرامے سٹیج کیا کرتا تھا۔ چنانچہ امجد نے ڈرامے لکھنے شروع کئے جو ان کی نگرانی میں سٹیج ہوتے رہے۔ بعد میں مرحوم ہفت روزہ "عروج" کے ایڈیٹر مقرر ہوتے۔ یہ ہفت روزہ محکمہ دیہات سدھار کا آرگن تھا۔ اور ڈپٹی کمشنر کی نگرانی میں شائع ہوتا تھا۔ ان سے قبل شیخ محمد یوسف شاہ بار ایٹ لا سابق مشیر تعلیم حکومت افغانستان ایڈیٹر تھے۔ امجد مرحوم نے اخبار کو سرکاری دفاتر کی براہ راست نگرانی سے واگذار کرایا اور اپنا الگ دفتر قائم کیا۔ یہ دفتر دراصل شعر و ادب والوں کا مرکز بن گیا۔ اس عہد کے ہندو مسلم سکھ شاعر اور ادیب بلا تخصیص دفتر "عروج" میں بلا ناغہ شام کو مل بیٹھتے گپ بازی ہوتی۔ مختلف مسائل زیر بحث آتے۔ انہی دنوں ہندوؤں کا ایک ہفتہ وار اخبار "جھنگ سیال" کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ عروج اور

جھنگ سیال میں مسائل پر سوچنے اور لکھنے کا انداز جُدا تھا۔ دونوں میں چشمک شروع ہوگئی۔ مگر صرف اخبارات کے کالموں تک ورنہ دونوں اداروں کے کارکن باہمی شیر وشکر تھے۔ ان کی مجلسی زندگی یکساں تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ مجید امجد نے بحیثیت اخبار نویس علاقہ کے مسلمانوں کو آزادی اور جُدا قومیت کا شعور دیا تو غلط نہ ہوگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قیامِ پاکستان سے قبل صحافت نظریاتی اور فکری تحریک کا نام تھا۔ اخبار نویس خونِ جگر سے اخبارات کے کالم لکھا کرتے تھے۔ وہ ایک ذہن تیار کیا کرتے تھے۔ آج کی صحافت محض تجارت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے صحافت کو تجارتی بنیادوں پر میزان کرنے کی طرح پڑی ہے۔ قومی قیادت کا فقدان ہوگیا ہے۔ قومی کردار کی نفی ہوتی ہے۔ لالچ تحریص بلیک میلنگ نے پورے معاشرے کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں اخبارات کے صفحہ اوّل پر قومی نظمیں شائع کی جاتی تھیں۔ امجد مرحوم نے "عروج" کے صفحہ اوّل کے لئے نظم لکھی اور کاتب کو دے کر خود لاہور ایک مشاعرہ میں شمولیت کے لئے چلے گئے مگر کاتب سے وہ نظم گم ہوگئی۔ کاتب کو احساس تھا کہ نظم کے بغیر پرچہ چھپ گیا تو جواب طلبی ہوگی۔ اس نے مجید امجد کے کاغذات میں سے ایک اور نظم جو باغیانہ قسم کی تھی، نکال کر چھاپ دی۔ اس کا عنوان "قیصریت" تھا۔

"عروج" شائع ہوا تو سرکاری حلقوں میں کہرام مچ گیا۔ عروج کے دفتر پر چھاپہ پڑا۔ پولیس نے ریکارڈ قبضہ میں کر لیا۔ امجد مرحوم کے وارنٹ جاری ہوتے واپس آتے تو حالات درہم برہم تھے۔ مگر مرحوم کا حوصلہ دیکھئے کہ کاتب کو بچانے کے لئے تمام الزام اپنے سر لے لیا۔ ایک عرصہ مقدمہ بازی کا سلسلہ چلتا رہا۔ بالآخر مصالحت کی فضا پیدا ہوتی اور کارروائی ختم ہو گئی۔ ۱۹۳۸ء میں امجد مرحوم نے حضرت عمرؓ کا خط دریائے نیل کے نام سے تاریخی واقعہ پر نظم لکھی جو "حدیث نیل" کے نام سے شائع ہوتی۔ یہ پہلی نظم تھی کہ جس نے ان کی شہرت کو ہندوستان کے کونے کونے تک پہنچا دیا۔

یہ نظم پشاور سے راس کماری تک تمام مسلم اخبارات اور جرائد نے شائع کی۔ انگریزی، فرنچ اور جرمنی میں اس کے تراجم ہوتے اور مجید امجد کی شہرت بلندیوں پر پہنچ گئی۔ ۱۹۳۹ء میں مجید امجد "عروج" سے علیحدہ ہو گئے اور ڈسٹرکٹ کونسل کی انجینئرنگ برانچ میں ملازمت اختیار کر لی۔ اسی زمانہ میں نیرنگ خیال، شاہکار، مخزن، ہمایوں، ادبی دنیا، زمزم، مدینہ، عصمت جیسے جرائد میں مستقل چھپنے لگے اور نظم کے ساتھ ساتھ غزل کی طرف بھی رجوع کیا۔

۱۹۴۲ء میں محکمہ خوراک میں انسپکٹر کے عہدہ پر تقرر ہوا۔ لائل پور گوجرہ، لاہور، سرگودھا ایسے مقامات پر تعینات کئے گئے۔ جس شہر

میں جاتے، ادبی حلقے ان کا گھیراؤ کر لیتے اور محفلیں جمتیں۔ پاکستان بننے کے بعد اسے "ایف۔ سی ہو کر لاہور تعینات ہوئے۔ اتفاق سے ایک مرتبہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی صدارت کر بیٹھے۔ پولیس نے ان کے خلاف رپورٹ کر دی۔ ان کو "سرخوں" کی فہرست میں شامل کر لیا۔ محکمہ خوراک نے تنزلی کر کے پھر انسپکٹر بنا دیا۔ اور ساہیوال تبدیل کر دیئے گئے۔ ساہیوال میں جا کر ادبی محفلوں کی جان بنے۔ منیر نیازی کے اخبار "سات رنگ" کو مجید امجد ہی مرتب کرتے رہے۔ پانچ سال کے بعد محکمہ نے پھر ترقی دے کر اے۔ ایف۔ سی بنا دیا۔ مرحوم دنیاوی دھندوں میں الجھنا پسند نہ کرتے تھے۔ اپنے جائز حقوق کے لئے بھی کسی کے سامنے سائل کی حیثیت سے پیش ہونا توہین سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ریٹائرمنٹ ہونے تک اے۔ ایف۔ سی رہے اور ان کے جونیئر ترقیاں پا کر بڑے بڑے عہدوں پر جا پہنچے۔ مرحوم مستعفی تھے بسنہ ۱۹۶۷ء میں ملازمت سے ریٹائر ہو گئے۔ ان کا ساہیوال میں اثاثہ ایک معمولی کوارٹر تھا۔ جس میں آم کے دو درخت اور گلاب کے دس پودے مرحوم نے خود لگائے تھے۔ کتابیں، اخبارات، احباب کے خطوط تین جوڑے لباس، ایک عینک، ایک ٹارچ اور ایک کلائی کی گھڑی۔ —— بس یہی کچھ ان کا اثاثہ تھا۔ ملازمت کے دوران جب کہ چار سو روپے تنخواہ ملتی تھی۔ ہر ماہ تنخواہ لینے کے بعد دس بارہ منی آرڈر تا زندگی

دوسروں کو بھجواتے رہے۔ یہ رقم وہ کن لوگوں کو بھجواتے تھے۔ اب تک راز ہے اور شاید راز ہی رہے۔ ہر وقت دوسروں کی مدد کے لئے تیار رہتے مگر اپنے دکھوں کا اظہار کسی سے نہ کرتے۔ کسی کو شریکِ غم نہ بنایا۔ وہ دوستوں پر کوئی بار ڈالنے کے قائل ہی نہ تھے۔ ۱۹۷۳ء کی ایک صبح غریب خانہ پر تشریف لاتے۔ ان کی مرضی کے خلاف محفلِ شعر و سخن شروع ہوگئی۔ مرحوم نے تازہ نظمیں سنائیں۔ آخری ملاقات ۱۵؍ مارچ ۱۹۷۴ء کو ہوئی۔ اس موقع پر مرحوم نے وعدہ کیا کہ وہ وسط مئی تک جھنگ مستقل طور پر آ جائیں گے۔ مجھے ہرگز یقین نہ تھا۔ لیکن ۱۱؍ مئی کو رات دو بجے وہ واقعی مستقل طور پر جھنگ آگئے اور ۱۲؍ مئی کی صبح کو منوں مٹی تلے سو گئے۔

ڈاکٹر وزیر آغا

خرقہ پوش و پابہ گل

آج سے سترہ برس پہلے اپنی نظموں کے بارے میں مجید امجد نے لکھا تھا:

"ماضی کی راکھ سے میں نے جن چبھتی چنگاریوں کو چُنا ہے ان کے ماتھے پر ان شب و روز کے نقش قدم ہیں جو اس کائنات اور اس کے حسن پُراسرار کے دھیان میں کٹ گئے ہیں۔ میری داستانِ عجز یہی نظمیں ہیں۔ فکر و سوز کے لہو سے لتھڑے ہوئے یہی چند اوراق ہیں۔ سب سے بڑھ کر خلش اس بات کی ہے کہ یہ بیان نامکمل، یہ اظہار ناتمام جس کی بنیاد محض تسکینِ ذوق تھی۔ فن کی ان بلندیوں تک نہ پہنچ سکا جو میرا مقصودِ نظر تھیں۔"

اپنی اس مختصر سی تحریر میں مجید امجد نے اپنی ذات اور مسلک سب کو سمیٹ لیا ہے۔ اس کی شخصیت اس بات سے مترشح ہے کہ گردن فرازانِ ادب کے مقابلے میں اس نے "فقیرا ہو روی نیواں ہو" کا منظر دکھایا ہے۔

اس کی ذات کا پھیلاؤ اس بات سے عیاں ہے کہ اس نے کائنات کے پس منظر میں "حسن پر اسرار" کا ادراک کیا ہے۔ اسے زمان و مکاں کی حدود میں قید کر کے نہیں دیکھا اور اس کا مسلک اس بات سے ظاہر ہے کہ اس نے یہ نظمیں محض تسکین ذوق کے لئے لکھی ہیں کسی نظریاتی مسلک کے تابع ہو کر نہیں۔ گو ان میں معاشرے کی کروٹوں کا جو شعور جھلکتا ہے وہ ڈھول تاشوں کے ساتھ نظریاتی پراپیگنڈہ کرنے والوں کے شعور سے کہیں زیادہ پختہ اور جاذبِ نظر ہے۔

میں اپنے اس مضمون میں نہ تو مجید امجد کی شخصیت کا ذکر کروں گا۔ (ہر چند یہ شخصیت انتہائی خوبصورت اور دلآویز ہے) اور نہ اس کے مسلک کا (ہر چند یہ مسلک فن کی تخلیق اور ترویج کے سلسلے میں انتہائی پُرخلوص اور صحت مند ہے) بلکہ صرف اس کی ذات کا ذکر کروں گا جس کا پھیلاؤ اور وسعت اتنی زیادہ ہے کہ زمانے کی تینوں پرتیں اس میں سمٹ آئی ہیں اور جو زمانی اعتبار سے اتنی کشادہ ہے کہ لاکھوں کروڑوں سالہائے نور کے فاصلوں میں جکڑی ہوئی ہیں۔ کہکشائیں اس کے نقوشِ قدم بن گئی ہیں اور جس کے سامنے زمینی زندگی کے جملہ ادوار یوں ہم رشتہ کھڑے ہیں جیسے کوئی مرد بان ہو جس پر زندگی نے چڑھنا شروع کیا اور اب وہ اس کے روبرو آکر کھڑی ہو گئی ہو۔

مجید امجد کی ذات کے پھیلاؤ میں "اب" کا یہ لمحہ خاص اہمیت رکھتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ "اب" وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے گرد اس کی ذات دائرہ در دائرہ پھیلتی چلی گئی ہے۔ تاہم مجید امجد نے اس مرکزی نقطے پر قدم رکھ کر ازل سے ابد تک کے فاصلوں کو طے کیا ہے : ؎

اور ادھر باہر گلی میں
خرقہ پوشِ و پابہ گل
میں کہ اِک لمحے کا دل
جس کی ہر دھڑکن میں گونجے دو جہان کی تیرگی
زندگی ! اسے زندگی !!

ن۔م۔ راشد نے اپنی مشہور نظم "زمانہ خدا ہے" میں لکھا تھا: ؎

اسی ایک رسّی کے دونوں کناروں سے ہم تم بندھے ہیں
یہ رسّی نہ ہو تو کہاں ہم میں تم میں
ہو پیدا یہ راہِ وصال
مگر ہجر کے ان وسیلوں کو وہ دیکھ سکتا نہیں۔
جو سراسر ازل سے ابد تک تنے ہیں
جہاں یہ زمانہ ـــــ ہنوز زمانہ
فقط اِک گرہ ہے

خوبصورت خیال ہے۔ راشد نے وقت کو ایک لمبی رسی سے تشبیہ دی ہے۔ جس میں حال محض ایک گرہ ہے۔ گرہ کو کھول دیجئے تو حال وقت کی رسی میں گم ہو جائے گا۔ مگر جہاں راشد نے وقت کی گرہ کو ذرا فاصلے سے دیکھا ہے وہاں مجید امجد نے رسی کی گرہ کو اپنی مٹھی کی گرفت میں لے لیا ہے ضمناً مجید امجد کو اس کا فائدہ یہ بھی پہنچا ہے کہ اس نے ایک صوفی کی طرح وقت کے ابعادِ ثلاثہ پر غور و فکر نہیں کیا۔ بلکہ ان میں سے ایک پر اپنا قدم رکھ کر باقی دونوں کی طرف اپنے ہاتھ پھیلا دیتے ہیں۔ یوں اس کے ہاں ذات کے پھیلاؤ کا عمل ذہنی ورزش کی بجائے ایک داخلی واردات بن گیا ہے۔ مثلاً اپنی نظم "جیون دیس" میں مجید امجد نے ماضی کو تو یوں دیکھا ہے کہ:-

"بوڑھی، کبڑی دیواروں کے پاؤں چاٹتی گلیاں
ٹوٹتے فرش، اکھڑتی اینٹیں
گزرے دنوں کے ملبے"

اور مستقبل کا یوں نظارہ کیا ہے:-

"بجتی ڈھولک، گاتی سکھیاں، تیر بہاتی خوشیاں
جاگتے ماتھے، سوچتے نیناں
آنے والے زمانے"

مگر حال کو ایک ایسی ریڑھی والے کے روپ میں دیکھا ہے جس کا کام

زخمی کلیاں بانٹتا ہے :ـ

"کنٹھا پہنے، اک متوالا بالا، ریڑھی والا
موڑ موڑ پر جیون رات کی
زخمی کلیاں بانٹے
جینے کے یہ سارے جتن، انمول سمے کی مایا
سدا رہیں ان سدا بہار دکھوں کے روپ سیانے
تو بھی رُک کر اس بھنڈار سے اپنی جھولی بھر لے
تیری تڑپ کا انت یہی ہے
اے دل! اے دیوانے!"

دیکھئے کہ مجید امجد نے "اب" کے اس لمحہ کو گرہ کے طور پر نہیں بلکہ ایک بھنڈار کے طور پر دیکھا ہے۔ گرہ باندھتی ہے۔ بھنڈار تقسیم کرتا ہے گرہ رکھنے کا ایک لمحہ ہے۔ بھنڈار لمحے کی وہ شاخ ہے جس پر دکھوں اور خوشیوں کے پھول کھلتے ہیں۔ اور پھر یہ سارے پھول خلقِ خدا میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ مجید امجد کے نزدیک "حال" کا یہ لمحہ گزری ہوتی یادوں کا مدفن نہیں۔ اور نہ یہ مستقبل کے خوابوں کا دفینہ ہے۔ بلکہ ایک سرخ پھولوں سے لدی ٹہنی ہے جو راہگیروں کے پاؤں پڑتی ہے کہ خدا کے لئے رُک جاؤ! مگر راہی ایسے بدقسمت ہیں کہ اس کے وجود تک سے بے نیاز ماضی کی یادوں

میں گم یا مستقبل کے خوابوں میں محو آگے کو بڑھ جاتے ہیں۔ حال کے لمحے پر رک کر امکانات کو گرفت میں لینے کا یہ رویہ ایک بڑی حد تک موجودی رویہ ہے اور مجید امجد نے اسی کے تحت بھرے میلے میں صبح کی اس شاہزادی کو ڈھونڈ لیا ہے۔ جس کی مست انکھڑیوں سے صباحتے امروز چھلکتی ہے:

یہ صباحتے امروز جو صبح کی شاہزادی کی مست انکھڑیوں سے ٹپک کر
یہ دورِ حیات آگئی ہے، یہ ننھی سی چڑیاں جو چھت میں چہکنے لگی ہیں
ہوا کا یہ جھونکا جو میرے دریچے میں تلسی کی ٹہنی کو لرزا گیا ہے
پڑوسن کے آنگن میں پانی کے نلکے پہ یہ چوڑیاں جو چھنکنے لگی ہیں
یہ دنیائے امروز میری ہے میرے دلِ زار کی دھڑکنوں کی امین ہے
یہ اشکوں سے شاداب دو چار صبحیں، یہ آہوں سے معمور دو چار شامیں
انہی چلمنوں سے مجھے دیکھنا ہے وہ جو کچھ کہ نظروں کی زد میں نہیں ہے

حال کے اس لمحے کا ذکر کرتے ہوئے مجید امجد نے اکثر اسے ایک گہرے غم سے لبریز پایا ہے۔ مگر یہ غم یاسیت یا قنوطیت کے مترادف نہیں بلکہ وارفتگی شوق، جستجوئے مسلسل اور کشف ناتمام کا دوسرا نام ہے۔ یہ غم گرفت سنگ میں بل کھاتی آبجو کی طرح ہے کہ چھلکتا بھی نہیں اور رکتا بھی نہیں۔ لہٰذا وہ راستہ جو ازل اور ابد کے مابین پھیلا ہوا ہے۔ غم کی اس "آبجو" ہی کی گزرگاہ ہے۔ اب آپ دیکھئے کہ راشد کی رسی اور مجید امجد کی آبجو میں

کس قدر فرق ہے اور پھر رسّی کی گرہ اور آبجو پر جھکی ہوئی پھولوں بھری ٹہنی کتنی مختلف چیزیں ہیں۔ دراصل مجید امجد کا لمحہ حال امکانات کا منبع ہے۔ اور اس سے جو شے پھوٹتی ہے وہ کا ہے غم کا ہے مسرّت اور اکثر مسرّت سے لبریز غم کا روپ دھار لیتی ہے۔

مجید امجد کے نزدیک حال کا لمحہ ماضی کے پھیلے ہوئے ہاتھ کی آخری حد نہیں اور نہ یہ مستقبل کے بازو کا نقطۂ آغاز ہے بلکہ یہ ایک ایسا دھبّہ ہے جس میں بیتے جگوں اور آنے والے زمانوں کے نقوش یکجا ہوگئے ہیں مگر اس لمحے کو محض ایک سنگم کہہ دینے سے بھی بات نہیں بنتی کیونکہ درحقیقت یہ لمحہ آتش تخلیق کا لمحہ ہے اور اس سے رس نچوڑنا یا سرور کشید کرنا بجائے خود ایک بہت بڑا انعام ہے: ؎

رس اگنی سے، اس جیتے جگوں
کی کھلتی ہوتی پھلواڑی سے
دو چار دہکتے پھول چنو
اتنا ہی سہی، اتنا تو کرو

اور پھر "صاحب کا فروٹ فارم" میں ذرا کھل کر کہا: ؎

سبو میں بھر لو
یہ پتیوں پر چمے ہوتے زرد زرد شعلے، یہ شاخساروں پہ پیلے پیلے

پھلوں کے گچھے
جو سبز صبحوں کی ضو میں پل کر، کڑی دوپہروں کی رو میں ڈھل کر
خنک شعاعوں کی اوس پی کر
رتوں کے امرت سے اپنے نازک وجود کے آبگینے بھر کر حدِ نظر تک
بساطِ زر پر لہک رہے ہیں
شراب ان کی کشید کر لو
سبو میں بھر لو

مجید امجد کے ہاں لمحہ سے شراب کشید کرنے کا یہ عمل مزاجاً اپی کیورین نہیں ہے۔ ایک تو اس لئے کہ کشید کرنے کا یہ عمل دراصل تخلیقی عمل کی ایک صورت ہے۔ دوسرے اس سے جو شراب کشید ہوتی ہے۔ وہ جسمانی لذت یا کیف و سرور کی علامت نہیں بلکہ اس روحانی مسرت کی ایک صورت ہے جو کشف ذات کی مظہر ہوتی ہے۔ اس لئے تو مجید امجد نے اس شراب کو دکھوں کے رس سے تشبیہہ دی ہے اور لکھا ہے :

وہ دھوپ جس کا مہین آنچل
دلوں سے مَس ہے وہ زہر جس میں دکھوں کا رس ہے
جو ہو سکے تو اس سے بھر لو من کی چھاگل
کبھی کبھی ایک بوند اس کی کسی نوا میں دیا جلائے۔

تو وقت کی پینگ جھول جاتے ۔"

اس طرح "اے یقین حیات" میں لکھا ہے : ع

خروش شام وسحر میں کشید ہوتی ہوتی
شراب غم کا یہ اک جام، جس میں اتری ہے
تجلیوں کی برات
یہ ایک جرعۂ زہرآب، جس میں غلطاں ہیں
تیری نگاہ کا رس تیرے عارضوں کے گلاب
تیرے لبوں کی نبات

صاف ظاہر ہے کہ مجید امجد "اب" کے لمحے سے کشید ہونے والے امرت کو ایک انوکھے تناظر میں دیکھ رہے ہیں اور اسے تخلیق کے لمحے کے مترادف قرار دے رہے ہیں۔ ایک ایسا لمحہ وارد ہوتا ہے تو زندگی ازل اور ابد ماضی اور مستقبل کی رسی سے آزاد ہو کر پھر سے ایک نقطۂ آغاز کا منظر دکھانے لگتی ہے۔

اس نقطۂ آغاز سے منسلک ہو کر مجید امجد نے جس آفاقی شعور (COSMIC CONSCIOUSNESS) کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ اقبال کے بعد مجید امجد ہی کی نظم میں پوری طرح اجاگر ہوا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ اقبال کا رویہ فلسفیانہ ہے۔ جب کہ مجید امجد نے سائنسی سوچ

سے استفادہ کیا ہے مثلاً بہت کم شعرا کے ہاں فلکیات سے شغف و شواہد ملیں گے۔ لیکن مجید امجد کے ہاں ایک ایسا آفاقی ڈرامہ دکھائی دے گا جو کروڑوں اربوں سالہائے نور کی بساط پر پھیلا گیا اور جس کے کردار کہکشاں ہیں اور سورج ہیں۔ بے شک مجید امجد نے فلکیات کی مخصوص زبان استعمال نہیں کی ورنہ وہ نیبولا اور QUASER اور POLSER اور SUPER NOVA اور ORION NEBULA اور لاتعداد دوسرے آفاقی مظاہر کی طرف بار بار اشارے کرتا۔ مگر اس کی نظموں کے مطالعے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس نے آفاقی ڈرامہ کا یہ گہرا مطالعہ کر رکھا ہے اور اس مطالعہ ہی سے اسے آفاقی شعور ارزانی ہوا ہے۔ ایک ایسا آفاقی شعور جس کی روشنی میں اس نے زمین کو مرکزِ دو عالم قرار دینے کی بجائے اس وسیع و لامحدود کائنات میں محض ایک موہوم سا نقطہ متصور کیا ہے۔ مجید امجد کے ہاں جو آفاقی شعور موجود ہے اس کے ثبوت میں ان کی لاتعداد نظمیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ میں صرف چند ٹکڑے پیش کرنے پر اکتفا کروں گا :-

یوں تو آفاق میں دنیاؤں کی ارزانی ہے
ان خلاؤں میں ستارے بھی ہیں، خورشید بھی ہے
ماہ بھی ہے

کون جانے کہ زمانے کے سمندر کی کوئی تھاہ بھی ہے

"نہ کوئی سلطنتِ غم"

تیرے ہی دائرے کا جزو ہیں وہ دور کہ جب
چٹانیں پگھلیں، ستارے جلے، زمانے ڈھلے
وہ گردشیں، جنھیں اپنا کے ان گنت سورج
تیرے سفر میں بجھے تو انہی اندھیروں سے
دوامِ درد کی اک صبح ابھری، پھول کھلے

"میرے خدا میرے دل"

ہواؤں پہ سایوں کے چھدرے سے دھبّے
فضاؤں میں صدہا سفید و سیاہ آفتابوں کے بکھرے سے ریزے
سرِ خاک، بے ربط، بے سطر خاکے
یہ سب کچھ، بس اِک دو قدم تک
پھر آگے وہی دھوپ
شاداب ذرّوں کی جانب ہمکتی ہوئی
سنگ ریزوں پہ بہتی ہوئی دھوپ
حدِّ عدم تک!

"یہ سبز پیڑوں کے سائے"

دلچسپ بات یہ ہے کہ مجید امجد کے ہاں کائناتی ڈرامہ کو دیکھنے کا انداز بھی سائنسی نہیں۔ اس نے زمینی ڈرامہ کو بھی اسی زاویے سے دیکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کی نظموں میں زوال آدم خاکی کی داستان پیش نہیں ہوتی بلکہ اس نے اپنی نظموں کو انسان کے تدریجی ارتقاء کی داستان بطور پس منظر مہیا کی ہے۔ انسانی زندگی کیسے شروع ہوتی۔ وہ کن ادوار و مراحل سے گزری اور اب کس مقام پر کھڑی ہے — اس ساری داستان کے پس منظر میں اس نے انسان کے آشوب آگہی کا ادراک کیا ہے۔ مثلاً مجید امجد کی نظم "راتوں کو" سے یہ ٹکڑا دیکھئے:

"ان سونی تنہا راتوں میں
دل ڈوب کے گزری باتوں میں
جب سوچتا ہے، کیا دیکھتا ہے، ہر سمت دھوئیں کا بادل ہے
———— "وادی و بیابان جل تھل ہے"
ذخار سمندر رسوکھے ہیں، پرہول چٹانیں پگھلی ہیں
دھرتی نے ٹوٹتے تاروں کی جلتی ہوتی لاشیں نگلی ہیں
پہنائے زماں کے سینے پر اک موج انگڑاتی لیتی ہے
اس آب وگل کی دلدل میں اک چاپ سنائی دیتی ہے
اک تھرکن سی، اک دھڑکن سی، آفاق کی ڈھلوانوں میں کہیں

تانیں جو ہمک کر ملتی ہیں، چل پڑتی ہیں، رکتی ہی نہیں
ان راگنیوں کے بھنور بھنور میں صدہا صدیاں گھوم گئیں
اس قرن آلود مسافت میں لاکھ آبلے پھوٹے، دیپ بجھے
اور آج کسے معلوم خمیر ہستی کا آہنگ تپاں
کس دور کے دیس کی کہروں میں لرزاں، لرزاں، رقصاں، رقصاں
اس سانس کی رو تک پہنچا ہے
اس میرے میز پہ جلتی ہوتی قندیل کی لو تک پہنچا ہے
کون آیا ہے؟ کون آتا ہے؟ کون آئے گا؟
ان جانے من کی مورکھتا کو کیا کیا دھیان گزرتا ہے
دل ڈرتا ہے
دل ڈرتا ہے ان کالی اکیلی راتوں سے دل ڈرتا ہے!"

یہاں بھی یہ بات مدِّ نظر رہے کہ مجید امجد نے انسانی ارتقا کو علم الانسان کی مخصوص زبان میں بیان نہیں کیا ورنہ وہ داما پیتھکس، آسٹرلو پیتھکس، ہومو ایرکٹس اور ہومو سیپیس وغیرہ کی طرف جا بجا اشارے کرتا۔ اس کے بجائے اس نے یہ کیا کہ اس علم کو اپنی ذات میں جذب کر کے ایک زاویۂ نگاہ کو یوں جنم دیا ہے۔ جو اس کے متخیلہ کا جزو بن کر نظم کی بنت میں شامل ہو گیا ہے۔ یوں مجید امجد نے انسان کو اس کی روایتی داستان

کے پس منظر میں دیکھنے کی بجائے ایک بالکل نئے سائنسی تناظر میں دیکھا ہے۔ نتیجتہً اس کی نظم بیسویں صدی کے انکشافات کی پوری رو سے ہم آہنگ ہوگئی ہے۔ یہ بات مجید امجد کے معاصرین میں سے کسی ایک کو بھی نصیب نہیں ہوسکی۔

مجید امجد کے ہاں "حال" ایک نقطۂ آغاز ہے اور اسی نقطے پر کھڑے ہو کر اس نے کائنات کی لامحدود وسعت اور انسانی زندگی کے تدریجی ارتقاء کا ادراک کیا ہے۔ اور اس پر یہ انکشاف ہوا ہے کہ موجود کا یہ لمحۂ مختصر جو اس کی ہتھیلی پر ایک لبالب پیالے کی صورت موجود ہے۔ امکانات کا منبع اور مخزن ہے۔ اور اسی مقام سے ہر بار ایک نئے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ پابہ گِل ہوتے بغیر عرفان کی منازل کو طے کرنا ممکن نہیں ہ

سیّد جعفر طاہر

مجید امجد اوران کی شاعری

(پاکستان نیشنل سینٹر راولپنڈی میں مجید امجد کے دیوان "میرے خدا میرے دل" کی افتتاحی تقریب میں ۱۴، نومبر ۷۶ء کو پڑھا گیا)

مجید امجد ہمارے دور کے بڑے شاعر بھی ہیں اور اہم بھی۔ بڑے غالبؔ، انیسؔ اور اقبالؔ کے معنوں میں، اہم یوں کہ ان کے مطالعے بغیر ہمارے شاعرانہ ذوق اور فنی ارتفاع کی تربیت نامکمل رہے گی۔ ان کا مطالعہ ارتقائے ذہنی اور عرفانِ حیات وکائنات کے لئے بے حد ضروری ہے۔ ان کا شاعرانہ اسلوب اور دلبرانہ لب ولہجہ ہمارے دور کے تہذیبی میلانات کی بڑی مکمل اور خوبصورت تصویر ہے۔ یہ تصویر مسرت بخش بھی ہے اور غم انگیز بھی۔ اس تصویر کی جزئیات وہ اٹل اور تلخ سچائیاں ہیں جو تیز آروں کے چلتے کھلتے دندانوں کی طرح ہماری روحوں میں اتر تی چلی جاتی ہیں اور اس تصویر کے رنگ اس بدنصیب عروس کی پیلی پیلی ہتھیلیوں کے سے ہیں، جن کی مہندی قضا کے ہاتھ نے سہاگ رات کو نوچ ڈالی ہو اور جس کی مانگ کا سیندور موت کے تیز نکیلے زرد ناخنوں نے کھرچ ڈالا ہو غم ہمارے شوریدہ سر جذبات اور منہ زور ولولوں کی تطہیر کرتا ہے۔ اور مجید امجد

کی شاعری اسی غم کی ترجمان ہے۔ ان کے فنی تصورات عالم بشریت کے تقاضوں سے نمو پاکر اپنے وجود کے بے نمود ہونے کا نوحہ بھی ہیں اور نغمہ بھی۔ انسانی معاشرت ہماری روزمرہ زندگی کے معاملات، کارگاہ تمنا اور وارداتِ کائنات کو کم از کم ہمارے دَور میں مجید امجد سے بڑا دردمند، حساس اور ان سے زیادہ دیانت دار محرم اور کوئی نہیں ملا۔ ان کے ہم عصروں میں عظیم شاعر عظیم ادیب اور عظیم انسان بھی ہیں لیکن اس سے بڑھ کر شاید توہینِ عظمت بھی کبھی نہیں ہوتی —— مجید امجد کی طرح پراسرار دائروں، افق در افق پھیلی ہوئی بیکراں چلچلاتی خلاؤں اور دائرہ در دائرہ الجھتی مڑتی تڑتی اور ٹوٹ ٹوٹ کر پھر سے جڑتی ہوئی قوسوں اور امنگوں کی لہلہاتی ہوئی کہکشاؤں کو کوئی اور بالغِ نظر شاعر نہیں ملا۔ گدرائی ہوئی دھوپ میں لہراتی ہوئی چراگاہوں پر اونچے درختوں سے ڈھکی ہوئی راہوں پر، بس بھرے ارمانوں پر اور سسکتی ہوئی سانسوں کے ویرانوں پر اور کسی شاعر نے اس خلوص اور دردمندی سے آنسو نہیں بہاتے۔ کسی شاعر نے ہواؤں، دریاؤں اور آبشاروں کا دکھ مجید امجد کی طرح نہیں بانٹا۔ تہذیب کے آروں تلے کٹتے ہوتے درختوں کے جنازوں کو چوم چوم کر کسی اور شاعر نے مرثیے نہیں لکھے۔ وہ چھلکتے ہوتے پیمانوں اور گونجتے ہوتے میخانوں کا شاعر نہیں۔ مجید امجد ہونکتے ہوتے جھونکوں، دریچوں میں لرزتے ہوتے تلسی کے پودوں، مٹتے ہوتے پیلے پیلے پھولوں، زندگی کے اجڑتے اور لٹتے ہوتے میلوں جھمیلوں اور جمگھٹوں کا شاعر

بہتے آنسوؤں میں نہا کر اس کی روح کو نکھار اور دوری کی سلاخوں پر کسی کباب کی طرح جل بھن جانے کے بعد اس کی پیمبرانہ فطرت کو قرار ملتا ہے۔ دنیا اس کے نزدیک مصحف اندوہ گراں جانی اور زندگی انہیں اوراقِ تمنا کی تلاوت اور ورق گردانی ہے۔ اس کا سرمایہ حیات غم ہے، مگر کیسا غم — میں سمجھتا ہوں کہ ہم میں اور مجید امجد میں ایک بہت بڑا بُعد اور ایک اَن مٹ تفاوت ہے۔ ہم اُس کا غم کرتے ہیں جو ہمیں حاصل نہیں ہو سکا، جو ہماری دسترس سے باہر ہے، جو ہمیں نصیب نہیں لیکن مجید امجد کو اپنے ہونے کا غم ہے۔ زندگی اور اس کے اسرار و غوامض کی ساری چھان پھٹک اور جانچ پرکھ اس کے نزدیک ایک رنج پشیماں نگہی کے سوا اور کچھ نہیں۔ کیا وہ محض اس لئے پیدا کیا گیا کہ خمستانِ دوراں سے دو گھونٹ ہی پی سکے۔ کیا وہ اس لئے دنیا میں لایا گیا کہ ابد و ازل کی فصیلوں میں گھر کر سانس لینے کے لئے ایک دو رخنے ہی ڈھونڈتا پھرے؟ اسے بے شک دیکھنے کے لئے دو آنکھیں بخشی گئیں۔ لیکن اسے یہ غم ہے کہ شبستانِ بقا میں یہ دو ننھے سے چراغ جلد بجھنے والے ہیں اور یوں اسے اپنی تہی دامانی اور سلسلۂ زندگی فانی کا وہ عرفان حاصل ہو جاتا ہے۔ جو گنگناتی لفظیات میں ڈھل کر ایک صاحبِ فکر و نظر شاعر کا غم بن جاتا ہے۔

مہ و انجم کے طلسمی سفینوں کی طرف ہاتھ بڑھانے کے ساتھ ساتھ اسے اپنی زندگی کے بجھتے ہوتے شرارے اور ڈوبتے ڈولتے ہوتے تارے کا احساس پھر اداس کر دیتا ہے۔ اور یہ اداسی مجید امجد کے فن کی ایک دائمی قدر اور ایک ارمانوں سے

پھیکی ہوتی ہمیشگی اختیار کرلیتی ہے۔ مرثیہ اور چیز ہے۔ اس کا موضوع، اس کے محرکات، اس کے تلازمات جن تصورات سے ابھرتے ہیں ان کا تعلق ہماری جذباتی اور بے شک رومانی زندگی سے ہے۔ لیکن مٹی کی ہٹتی ہوتی مہک اور رنگوں کی ڈوبتی ہوتی جھلک دیکھ کر محرومئ جاوید کا احساس بڑی شاعری ہے۔ مجید امجد کے ہاں موت کی استعاراتی فضا اور تخیّل کی علامتیں اتنی شدید اور واضح ہیں جنھیں اندھے بھی نظر انداز نہیں کرسکتے۔ وہ زندگی سے لطف اٹھانے کی بات کرتے کرتے خوشیوں اور محبتوں کے ان سرچشموں کے اجڑجانے کا بھی ماتم کرتے نظر آتے ہیں۔ انہیں آفاق میں دنیاؤں کی ارزانی نظر آتی ہے۔ اور یہ ہے بھی حقیقت کہ ان خلاؤں میں ستارے بھی ہیں، مہر و مہ بھی ہیں، حسینانِ کج نگاہ بھی ہیں اور ترکانِ خوش کلاہ بھی، مگر زمانے کے سمندر کی تھاہ کون جانے؟ مقدر کی لحہ بہ لحہ ایک دوسرے سے گلے ملتی اور جُدا ہوتی ہوتی لہروں کی پہیلیاں کون بوجھے؟ انہیں تو بس اتنا معلوم ہے کہ ان گہرائیوں میں غوطہ لگا کر دوبارہ کبھی نہ ابھرے گا۔ اسے یہ غم ہے کہ رفتہ بہاریں کیوں لوٹ کر نہیں آتیں اور خوشبوئیں چمن سے ہجرت کرنے کے بعد کیوں گلزاروں کی راہ بھول جاتی ہیں۔ ان کی نظمیں اسی شاعرانہ رویّے اور رجحان کی مظہر ہیں۔ شاعر کا حیات و کائنات کے متعلق ردِّ عمل سلیقے اور احساس کی بے نظیر شاعری ہے۔ اس کے کلام میں گہری بصیرت (DEPTH OF VISION) فکری توانائی اور محکم ژرف نگاہی (PROFUNDITY OF FORESIGHT)

پکار پکار کر ہمیں اپنی اور دوسروں کی خاک تربت کے بے نشان ہونے کا اعلان کرتے سنائی دیتی ہے :

کوئی غایت کوئی منزل، کوئی حاصل سفرِ ہستی کا
کوئی مقصود بلندی کا کہ مفہوم کوئی پستی کا
کوئی مشعل بھی نہیں، کوئی کرن بھی تو نہیں
شب اندھیری ہے گھٹا ٹوپ ہے طوفانی ہے
بولو اے نغمہ سرایان تحیر کدۂ کاہکشاں
میں کہاں جاؤں کہاں جاؤں کہاں جاؤں کہاں ؟

یہ خالص اور خوب صورت شاعری (PURE AND FINE) اردو کے بہت کم خوش نصیب شعراء کے حصے میں آتی ہے۔ ان کا تخیل اور سرمایۂ افکار بہت وسیع ہے۔ لیکن یہ تمام سرمایۂ افکار یہ ساری دولتِ دل بیدار یہ ساری متاع انوار جس ایوان جمیل میں محفوظ ہے۔ اس کا نام غم ہے۔ انہوں نے انتہائی فنکارانہ صناعی سے فن کی سچائی، کائنات کی اکائی اور غم کی یکتائی کو نہ صرف پالیا بلکہ اپنالیا۔ ان کے اظہار و ابلاغ، اسلوب و انداز اور فکر و تخیل میں جو رابطہ محکم ہے۔ وہ عصرِ حاضر کے کسی اور فنکار کے یہاں بہت کم نظر آتا ہے بلکہ اس فکری گرفت اور فنی مہارت نے ان کے اسلوب کو ناقابلِ تقلید بنا دیا ہے۔ دولت و طاقت عظمت و شہرت اور مرتبہ و منصب ان کی ضرورتوں میں شامل نہ تھے۔ ان کا صرف ایک

مقصد تھا اور وہ تھا تجسس شاعرانہ ــــ مرگِ غریبانہ اور سلام رفیقانہ کے
ساتھ ساتھ وہ اپنے لئے عذاب جداگانہ بھی چاہتے تھے اور یہ عذاب انہیں
ملا۔ احساس اسی عذاب کا دوسرا نام ہے۔ ان کی کتنی حسین آرزوئیں غموں کی
بہتی ہوتی آگ کی رو میں بہہ کر جلتی روحوں کا روپ دھار گئیں۔ ان کی مسکراہٹوں
کی کتنی کرنیں دکھوں کے نیزے کھا کھا کر سنانوں کی انیوں پر جھول جھول گئیں۔
وقت کے سیمیں دھارے پر انہوں نے اپنے لہو سے کتنی سطریں لکھیں۔ وقت کے
ریگزار کی تپتی ہوتی سطح پر انہوں نے خون میں لتھڑ لتھڑ کر کتنی کروٹیں بدلیں، وہ
کروٹیں جن کی ایک ہی ضرب سے آج تک ان کی قبر کی چادر پسلیاں چیخ چیخ کر ٹوٹ
رہی ہیں اور پھر ان کی قبر کی مٹی اور سارا ملبہ راکھ کا ڈھیر ہو کر ایک دن وقت کے
کھنڈروں میں کھو جائے گا۔ لیکن ان کا نام یقیناً ان مشاہیر کے ساتھ زندہ رہے گا
جنہوں نے شعلوں پر قدم رکھا۔ یار حسن و دار حیات کو عظمتیں بخش دیں ــــ
ساری نظموں کی فضا حزن انگیز ہے۔ کلام میں چونکہ بے پناہ عنایت ہے۔ اس لئے
فلسفے کی گتھیاں بھی زلفِ یار کی شکنوں کی طرح الجھ الجھ کر سلجھنے لگتی ہیں۔ ان کی
محرومی غم تاب میں کبھی کبھی ایسے لمحے بھی آتے ہیں کہ وہ یادوں کے منوں جگا
کر اپنی تمناؤں کے تصویر کدے میں بیٹھ کر خود کو آواز دینے لگتے ہیں۔ آیئے وہ
آواز جو آج قبر کی مٹی تلے دفن ہے، ایک بار پھر سنتے چلیں۔ یہ آواز ان کے الفاظ
میں منشور ہے۔ یہ آواز پنجاب کی معاشرت اور ہمارے عوامی گیتوں کا متبرک

ارتقا ہے:

آج بھی جب کہیں رستے میں کسی موڑ کسی منزل پر
کسی دیوار سے کنکر بھی پھسل جاتا ہے
کوئی دامن کہ جیسے ناز گل افشانی ہے
دھوپ میں سوکھتی خرما کے چنگیروں سے بھرے کوٹھوں سے
ایک پل کے لئے اڑتا ہے ہٹتا ہے تو دھیرے دھیرے
کوئی بے مسی میرے احساس میں بھر جاتی ہے
نا ربربط کی کوئی لرزش پنہانی ہے،
جو شب و روز کے ایواں میں فغاں بن کے بکھر جاتی ہے
آسمانوں سے زمینوں سے کسی دل کے دھڑکنے کی صدا
کوئی چپکے سے میرے کان میں کہہ جاتا ہے
سنتے ہو کس کی یہ آواز ہے، پہچانی ہے

اس آواز سے شرافت کی خوشبو اور صدق تمنا کی مہک آتی ہے۔ یہ خوشبو یہ مہک ہمارے دل میں بس کر ہمیں اپنے اندر سمو کر اس ہنستی بستی دنیا کے ارمان کدوں کو ہماری آنکھوں کے سامنے لے آتی ہے۔ ان کے موضوعات سخن چونکا دینے والے نہیں۔ البتہ ان کی تکنیک حیرت زدہ کر دینے والی ہے۔ ان کی بحریں ہمارے دور کے بحرانوں کی آئینہ دار ہیں۔ ان میں مشینوں کی گڑگڑاہٹیں

ریلوے لائنوں اور انجنوں کی گڑگڑاہٹیں اور دریاؤں کی گنگناہٹیں ہیں۔ الفاظ اپنی نسبتوں کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ ان نسبتوں کو مفہوم اور معانی بھی کہتے ہیں۔ لیکن ان نسبتوں اور تلازموں کی تلاش و طلب اور دریافت بڑا جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس وادیِ پرخار میں برہنہ پا چلنا پڑتا ہے۔ کانٹوں کی پیاس اپنے لہو سے بجھا کر چشمۂ بقائے دوام تک پہنچنا ہوتا ہے۔ میرؔ کا، غالبؔ کا، انیسؔ کا اقبالؔ کا اور ہمارے عہد میں مجید امجد کا لہجہ اس: " بقائے دوام سے شاداب و سیراب ہونے کی خبر دیتا ہے۔ مجید امجد کی آواز میں زمانوں کے زمزمے، صدیوں کے نغمے اور کون و مکاں کی آوازوں کے آمیزے جھولتے اور لہراتے نظر آتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مردہ بستیاں جی اٹھی ہیں۔ ساری دنیا زندہ انسانوں سے آباد ہو گئی ہے۔ پڑوسن کے نلکے پر چوڑیوں کی جھنکاریں سنائی دینے لگی ہیں۔ سونی گلیوں میں گھنگھرو بولنے اور پازیبیں ڈولنے لگی ہیں۔ کچے مکانوں کی منڈیروں سے کوئی چاند سا چہرہ چھپ چھپ کر کنکریاں مارنے لگا ہے اور میٹھوں پر ننھے ننھے پرندے موسمِ بہار کے گیت گانے لگے ہیں۔ ساری دنیا ساز و آواز سے معمور ہو گئی ہے۔ اور خود یہ شاعرانہ آواز سینکڑوں من مٹی کے تلے آج دفن ہے۔ مجید امجد شرافت کی بولی بولتا، محبتوں کی کہانی سناتا، خلوص اور صداقت پرستی کے پھول بکھیرتا دنیا سے دور چلا گیا لیکن وہ اپنے شیلے ایسے پیمبرانہ لب و لہجہ اور اپنے الوہی تخیل کی لطافتوں اور کرن کرن پنکھڑیوں اور گلنار

تتلیوں کے جھرمٹوں میں آپ کو ہمیشہ مسکراتا ہوا ملے گا۔ اس کی باتوں میں بہاروں کی دھوپ ایسی دل کشی اور گلابی جاڑوں کے دنوں ایسی گرم جوشی ہوگی، اس کی پاکیزہ افسردگی اس کی مقدس اداسی اور اس کے حسن و یاس کی دل کش مہک، موہنی اور سہلاتا آپ کا من موہ لے گی۔ اس کی درویشانہ انکساری، پرخلوص وضعداری اور شائستگی میں سراسر سموئی ہوئی فنکاری اسے آپ کا عزیز دوست اور محبوب ترین شاعر بنا دے گی۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی چاندنی ایسی ملائم دل کشی آپ کو نہ صرف اس کی نظموں کا شاعرانہ عمل سمجھا دے گی بلکہ آپ یہ نقطہ بھی دریافت کر لیں گے کہ فطرت کا تخلیقی عمل کتنی خوشی اور آہستہ خرامی سے وقوع پذیر ہوتا ہے آپ دیکھیں گے کہ ایک البیلا چیلا شاعر، بانکی وقار اور انسانی جمال کے ساتھ زرّیں کرنوں کا عصا ہاتھ میں لئے مہر ومہ کی زرتار خلعتیں پہنے آہستہ آہستہ نشیب زینۂ ایام سے اترنے لگتا ہے کسی سرمائی ندی کی طرح دھیرے دھیرے اپنی رفتار کے روم پر بہتا بہتا فکر و فن کے گلکدوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو جاتا ہے۔ اور پھر ایک دن اس کی مٹی انہیں گلکدوں کی مٹی سے مل کر ایک ہو جاتی ہے اور ہم ان رفتہ بہاروں کے نوحہ خواں رہ جاتے ہیں:

لاکھوں سلام رفتہ رتوں کے رسول پر
لے خاکِ پاک جھنگ یہ آنسو قبول کر

انور سدید

مجید امجد کی غزل

میرؔ سے لے کر میراجی تک اردو غزل کے بہت سے متنوع رنگ سامنے آچکے ہیں۔ چنانچہ روایت کی ایک وضعدار پابندی کو برقرار رکھتے ہوئے ہر بڑے شاعر نے فکر و اظہار کے نئے شعری قرینے دریافت کرنے کی کوشش کی اور اس تنوع میں اب تک مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ وقت چونکہ کسی ایک نقطے پر جامد نہیں رہتا اور زندگی ہر لمحے ایک نیا پیش منظر مرتب کر ڈالتی ہے۔ اس لئے غزل نے بھی کسی ایک مخصوص سانچے پر مستقل طور پر قبول کر لینے کی بجائے گوناگوں تبدیلیوں کا ساتھ دیا اور نئے رویّوں کو اپنے تہذیبی پیکر میں ڈھالنے کے لئے نسبتاً نرم صورت اختیار کر لی غزل کی اس لچکدار خصوصیت کا فائدہ ولیؔ، میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، فراقؔ، ناصر کاظمی اور شکیب جلالیؔ نے بھی فائدہ اٹھایا اور اب ہمارے زمانے میں ظفر اقبال منیر نیازی، شہزاد احمد، وحید اختر، وزیر آغا، بدر بشیر، عتیق اللہ، ظہیر نفیس رضا ہمدانی اور محسن احسان بھی اٹھا رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب بھی کسی بڑے شاعر کا ظہور ہوتا ہے اور اس کی انفرادیت کھل کر سامنے آتی ہے

تو احساس ہوتا ہے کہ غزل ایک اور نئی کروٹ لیتی ہے اور اس کا ایک اور منفرد روپ سامنے آرہا ہے۔

نئی غزل کے نکھار میں مجید امجد کی شخصیت کا لمس بھی پوری طرح اثر انداز ہوا ہے لیکن غزل کے چند منفرد شعراء کی مندرجہ بالا نامکمل فہرست میں میں نے مجید امجد کا نام دانستہ شامل نہیں کیا۔ وجہ یہ کہ مجید امجد کی شاعری کو جس صنف نے دوام عطا کیا ہے وہ نظم کی صنف ہے۔ اردو نظم میں مجید امجد کی عطا یہ ہے کہ اس نے ہر نئے دور کے تجربوں میں دھاچوکڑی مچانے کی بجائے ہر دور کو اپنے تجربوں سے استفادہ کرنے کا موقع دیا۔ چنانچہ اس کی انفرادیت کا برملا اعتراف ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی،[۱] ڈاکٹر وزیر آغا[۲] اور مظفر علی سید[۳] نے مجید امجد کی زندگی میں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہ رہا کہ وہ اقبال کے بعد میراجی، ن۔م۔ راشد، یوسف ظفر اور اختر الایمان کے سلسلے کے ایک بہت بڑے شاعر ہیں۔ یہ اعتراف فی نفسہ بڑی اہمیت رکھتا ہے لیکن اس کا ایک نقصان یہ ہوا کہ مجید امجد صرف نظم کا شاعر ہو کر رہ گیا اور اس کی غزل جو ناقدین سے اس کی نظم کی طرح پوری

---

[۱] مجید امجد کی شاعری (سوغات جدید نظم نمبر) [۲] مجید امجد توازن کی ایک مثال (نظم جدید کی کروٹیں از وزیر آغا) [۳] مقالہ مظفر علی سید (مطبوعہ سویرا لاہور)

توجہ کا تقاضا کر رہی تھی، اس شہرت کے نیچے دب گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مجید امجدؔ اپنے پیچھے غزلوں کا کوئی قریب نظر انبار نہیں چھوڑا۔ پندرہ غزلیں "شبِ رفتہ" کا نتیجہ ہیں۔ دس غزلیں "فنون" کے جدید غزل نمبر کی زینت میں۔ ایک ایک غزل "ادبی دنیا" اور "اردو زبان" میں اور دو غزلیں "اوراق" میں شائع ہوئیں۔ حال ہی میں "سویرا" نے ان کی پانچ غزلیں شائع کی ہیں۔ ممکن ہے کچھ اور غزلیں رسائل کے اوراق میں بکھری پڑی ہیں جن پر نظر ڈالنا مشکل ہے۔ یوں بھی مجید امجد نے عمر بھر شہرت و اشاعت کے کسی میثاق پر عمل نہیں کیا اور کسی مدیر کے بالخصوص بلاوے کے بغیر کوئی چیز اشاعت کے لئے نہیں بھیجی۔ یہ امکان بھی خارج از حقیقت نہیں کہ ساہیوال کے ادب دوست احباب نے مجید امجد کے دوسرے ادبی اثاثے کے ساتھ ان کی غزلوں کا اثاثہ بھی یو.بی.ایل کے سیف ڈپازٹ لاک میں رکھ دیا ہوتا کہ اسے زمانے کی ہوا نہ لگے اور وہ دستبردِ ایّام سے محفوظ ہو جاتے۔ یہ سب بکھری ہوئی غزلیں تعداد میں یقیناً اتنی تو ہو جاتی ہیں کہ اگر انہیں اکٹھا کر لیا جاتے تو $\frac{20 \times 30}{16}$ سائز کا ایک باعزت ضخامت کا مجموعہ بن سکے۔ چونکہ انہیں ابھی تک یکجا کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں ہوئی، اس لئے بھی مجید امجد کی غزل پر اجتماعی نظر ڈالنے کا موقع پیدا نہیں ہوا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک بڑے شاعر کی خاص جہتِ اظہار بھی ابھی تک نادریافت پڑی ہے۔

(نوٹ) یہ مقالہ "شب رفتہ" کے بعد کی اشاعت سے پہلے لکھا گیا۔

پس منظر کے اس طویل معترضہ کے لئے میں معذرت خواہ ہوں لیکن اس سے مجھے صرف یہ یاد کرانا ہے کہ ہمارے تین سر برآوردہ ناقدین نے مجید امجد کو نظم کا ایک بڑا شاعر تو تسلیم کر لیا لیکن خود مجید امجد اس ایک صنف کے جزیرے ۔ ہی محبوس ہو کر نہیں رہ گئے بلکہ ڈاکٹر وزیر آغا کی طرح نظم کی نچلی منزل[۱] سے بلند ہو کر متعدد مرتبہ غزل کی بالائی منزل تک بھی پہنچے۔ یہاں منظر کی صورت ۔ ۔ تبدیل ہوگی۔ باریک جزئیات نے ایک واضح پھیلاؤ اختیار کیا۔ شخصی طرزِ اظہار نے اجتماعیت کا روپ دھارا۔ جذبات کے ذاتی کھُردرے کنارے گھس گھس کر اس طرح بیضوی ہو گئے کہ ان میں ہر شخص اپنے تجربے کا عکس دیکھ سکتا تھا۔ اور یوں مجید امجد کے نئے فکری میلانات اور تازہ فنی شعور سے غزل کا ایک ایسا روپ سامنے آیا جس کی تشکیل و تہذیب میں مجید امجد کے من کی تپتی جوالا نے بالخصوص حرارت و توانائی کا دان دیا تھا۔

مجید امجد کی غزل کا اوّلین اہم عنصر وہ معصوم حیرت ہے جو اس پر محبوب کی قربت سے وارد ہو جاتی ہے اور اس کی زندگی کے سارے منظر کو بدل ڈالتی ہے ـــــ حیرت کی یہ لہر اگرچہ یکساں اور مسلسل ہے۔ لیکن ہمیشہ

---

[۱] دیباچہ "غزلیں"

ایک جیسا تاثر پیدا نہیں کرتی۔ حیرت کے اس تاثر میں اولاً بہجت کی کیفیت شامل ہے اور یہ منظر کو یک دم پھلجھڑی کی طرح روشن اور منور بار کر ڈالتی ہے۔ ایسا جب بھی ہوتا ہے۔ وقت کے تمام فاصلے اِک خندۂ جانفزا میں سمٹ جاتے ہیں اور صاف نظر آتا ہے کہ مجید امجد نے فراق کو بھی ایک مسحور کن تجربہ بنالیا ہے۔ اور اب وہ اس سے ایک ایسی لذّت کشید کر رہا ہے جو زندگی کی بے پایانی حس میں مزید اضافہ کرتی ہے :-

جنون عشق کی رسم عجیب کیا کہنا ۔۔۔ میں ان سے دور وہ میرے قریب کیا کہنا
شاید ادھر سے گزرے پھر بھی تراسفینہ ۔۔۔ بیٹھا ہوا ہوں ساحل پر نے بلب کبھی کا
میری زیست پر ان کے جلووں کے نقش ۔۔۔ ابھرتے گئے، ون گزرتے گئے
خیال یار تیرے سلسلے نشوں کی رتیں ۔۔۔ جمال یار تیری جھلکیاں، گلاب کے پھول

کسی کی روح تک اِک فاصلہ خیال کا تھا
کبھی کبھی تو یہ دوری تو رہی سہی بھی نہ تھی

ثانیاً یہ حیرت میٹھے غم لطیف کا روپ دھارتی ہے اور مجید امجد کے دکھوں کو مجسم علامت میں ڈال دیتی ہے۔ تاہم یہ دکھ ایسا نہیں کہ مجید امجد کے اعصاب کو شل کر دے یا اس کے حواس پر غالب آجائے۔ اس دکھ نے تو مجید امجد کے ساتھ زندگی بسر کی ہے۔ اور یہ غم تو مجید امجد کی رگوں میں سرایت کر کے اس کے خون میں رچ بس گیا ہے۔ یہ غم ناامیدی یاس یا

قنوطیت پیدا نہیں کرتا بلکہ اس غم کی نوعیت سراسر تخلیقی ہے اور اسے زندہ رہنے اور زندگی کرنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ اس غم میں تازگی بھی ہے اور تحرک بھی اور اسکے ساتھ زندگی کرنا عین عبادت نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ غم مجید امجد کی غزل میں اک رواں دواں قوتِ فکر ظاہر ہوا ہے:

کسی کی روح سے تھا اور ربط اپنے حصّے میں تھی
وہ بے کلی جو ہے موجِ زماں کا حصّہ بھی ۔

خوشیوں کا مُکھ چوم کے دیکھا دنیا مان بھری
دکھ وہ سجن کٹھور کہ جس کو روح کرے سجدہ

ان آئینوں میں جلے ہیں ہزار عکسِ عدم
دوامِ درد تیرے رت جگے نہیں گزرے

امجد نشاطِ زیست اسی کش مکش میں ہے
مرنے کا قصد، جینے کا عزم ایک ساتھ کر

جہاں مجید امجد کی اس غزل کا تذکرہ بالخصوص ضروری ہے جس کی ردیف "تیرا غم" ہے اور جو وجدان اور جذبات کے اس تہذیبی رویے کو سامنے لاتی ہے جب عشق کی طویل نا دریافت مسافتوں میں غم ہی منزل ہوتا ہے اور غم ہی جادۂ منزل : ؎

غبار رنگ میں رس ڈھونڈتی کرن تری خوشبو گرفت سنگ میں بل کھاتی آب جو ترا غم

طلوعِ مہر، شگفتِ سحر، سیاہیِ شب
تیری طلب تجھے پانے کی آرزو ترا غم
ندی پہ چاند کا پرتو، تیرا نشانِ قدم
خطِ سحر پہ اندھیروں کا رقص، تو ترا غم
نگاہ اٹھی تو زمانے کے سامنے ترا روپ
پلک جھکی تو میرے دل کے روبرو ترا غم

اہم بات یہ ہے کہ مجید امجد کا غم معاشرے کے کسی عالمگیر اندوہ کا حصہ نظر نہیں آتا بلکہ زندگی کے کسی نامعلوم لمحے میں جب اس کے احساس میں لطیف پر توقف کی ہلکی سی چبھن پیدا ہوتی ہے۔ تو یہ غم تمام روایتی حد بندیوں اور بندھنوں کو توڑ کر یک ساعت یوں نمودار ہو جاتا ہے کہ شاعر کے فکر و ادراک اور ذوق و وجدان پر قیامت گزر جاتی ہے۔ اس زاویے سے دیکھئے کہ مجید امجد کے غم کا کوئی نام نہیں۔ لیکن دنیا کے ہر دکھ میں اس غم کا شائبہ موجود ہے۔ جذبے کی ایک لہر اٹھتی ہے اور تخیل کی دنیا میں تلاطم برپا کر دیتی ہے۔ سوچ کی اک شوخ ن بیدار ہوتی ہے اور دل کی دنیا میں طوفان آجاتا ہے۔ شاعر کی خوبی یہ ہے کہ وہ ناصح، مسیحا، واعظ، رقیب یا دوست کو مخاطب کرنے کے بجائے اس بے انت طوفان کا مداوا اپنے داخل میں تلاش کرتا ہے اور اس طوفانِ غم کو اپنے بدن

کی ڈھال پر برداشت کرتا ہے۔

مثال کے طور پر یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں مجید امجد کی جذباتی ندی میں ایک معمولی تموج بپا کر دیتا ہے ؎

جھکیں جو سوچتی پلکیں تو میرے دنیا کو
ڈبو گئی وہ ندی جو ابھی بہی بھی نہ تھی
عمروں کے معمورے میں ہے کوئی ایسا دن بھی جو
روح میں ابھرے پھاند کے سورج کے سیال سمندر کو
یہ کس حسین دیار کی ٹھنڈی ہوا چلی
ہر موجۂ خیال پہ صد ہا شکن پڑے
میں نے سمجھا ورنہ ہنگاموں بھری دنیا میں کب آہٹ کے سنگ
کوئی تو تھا آج جس کا قہقہہ دل میں ہے دامن گیر دل
سنی جو بات کوئی ان سنی تو یاد آیا
وہ دل کہ جس کی کہانی ابھی کہی بھی نہ تھی

ڈاکٹر خورشید الاسلام نے میرؔ، مومنؔ اور داغؔ کے عشق کو تین مختلف مذاہب قرار دیا ہے[۱]۔ مجید امجد کا زمانہ آیا تو آشنائی "پرستش" کیا ب کی جستجو

---

[۱] ذکر ہیں پری وش کا (فنون جدید غزل نمبر۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام)

اور ہوس کی "شائستگی" کا تمام کرو فر ختم ہو چکا تھا۔ پھر وقت ایسا آ
لگا تھا کہ عشق و عاشقی کے لئے عاشق اور محبوب دونوں کا گریجویٹ
ہونا ضروری ہو گیا۔ چتر ناری اپنی سندر [illegible] رسجا کر نکلتی اور چاتر
مرد اس پر توجہ کئے بغیر "اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا" کا ورد
کرتا۔ اور سندر ناری کو کسی دو [illegible] رے اناڑی پر کمند افگنی کا مشورہ دیتا۔
مشین نے جذبات پر قبضہ کرایا اور عشق خارِ گندم بن گیا جو جھوٹی تسکین
حاصل کرنے کے ہزاروں حربوں سے واقف تھا۔ حیرت ہوتی ہے، اس
کاروباری زمانے میں مجید امجد نے حسن کے باغ میں مزدوریاں کیں۔
لیکن حاصل کو محبوب کے تبسم رائیگاں کی نذر کر دیا کہ یہی اس کی مرضی،
اس کا حکم اور اس کی رضا تھی۔ ہمہ تن خود سپردگی کی یہ نہایت مجید امجد کی
غزل کا قیمتی اثاثہ ہے: ؎

سلام ان پہ تہہِ تیغ بھی جنہوں نے کہا — جو تیرا حکم، جو تیری رضا، جو تو چاہے
یہ زرد پنکھڑیاں جن پر حرف حرف ہو — ہوائے شام میں مہکیں ذرا جو تو چاہے

امجد جہاں بھی، ہوں میں سب اس کے دیار ہیں
کنجیں سہانے ہوں کہ ہوں جنگل گھناؤنے

تیری سانسوں کی سوغاتیں بہاریں — تیری نظروں کے نذرانے زمانے

چنانچہ وہ جو میر [illegible] نے کہ: ؎

عشق نے عشق کرنے والوں کو کیسا کیسا بہم کیا ہے عشق تو نئے زمانے میں عشق کی روایت بدل جانے کے باوجود مجید امجد کو جو عشق بہم ہوا ہے۔ اس میں قشقہ لگانے، دیر میں بیٹھنے اور ترکِ اسلام کرنے کا سراغ تو شاید نہیں ملتا۔ لیکن یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ اس پر عشق کے کسی عارف صادق اور سالک منزل کا سایہ تھا کہ جب عشق نے تھیّا تھیّا کر ، سمجھایا تو وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکا :-

میں جو تیری راگ سبھا میں داس رچانے آیا تھا
دل کی چھنکتی جھانجن تیری پازیبوں میں ٹانک آچکا
یہ رسم حاصلِ دنیا ہے، اک یہ رسمِ سلوک
ہزار اس میں سہی نفرتوں کا ایما بھی

چنانچہ جب اس نے اپنے وجود کو محبوب کی ہستی میں ختم کر لیا تو پھر نہ شاخِ گل پہ نشیمن بنانے کی ضرورت رہی اور نہ رازِ گل کی خبر لانے کی آرزو بلکہ وہ بیک جست عشق کے اس مقامِ بلند پر پہنچ گیا۔ جہاں صرف اس کے نشانِ قدم نے ، رحِ ابد پہ دوام حاصل کر لیا :-

میرے نشانِ قدم دشتِ غم پہ ثبت رہے ابد کی لوح پہ تقدیر کا لکھا نہ رہا
میری نگاہ میں دورِ زماں کی ہر کروٹ لہو کی لہر، دِلوں کا دھواں، گلاب کے پھول
طلوعِ صبح کہاں، ہم طلوع ہوتے گئے ، راقافلہ بے درا روانہ ہوا

دوسری طرف جب ہم مجید امجد کی غزل سے اس کے محبوب کے خدوخال مرتب کرنے کی سعی کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اس بت ہزار شیوہ کا پیکر رنگوں، روشنیوں، پھولوں، نغموں اور گیتوں غرضیکہ فطرت کے تمام متحرک عناصر لطیفہ سے مرتب ہوا ہے اور کہ اسے گرفت میں لینا ممکن ہی نہیں یہ محبوب غبار رنگ میں رس ڈھونڈتی کرن بھی ہے۔ اور گرفت سنگ میں بل کھاتی آب جو بھی، یہ دل کے برج کے فاصلوں کی فصیل سے ابھرتا ہوا عکس بھی ہے اور دستِ خیال میں جست بھرتا ہوا غزال زمانہ رقص بھی، یہ دوریوں کے سیل رواں پر تیرتا ہوا برگِ نَم بر بھی ہے اور دیارِ شب کے اندھیرے میں ڈولتی ہوئی بانسری کی لَے بھی۔ چنانچہ مجید امجد نے جب بھی اس محبوب سے قرب کی خواہش کی ہے کہ وہ لمحے کی طرح اس کے ہاتھ میں نہیں آیا اور شیشے کی ایک دیوار ان دونوں کے درمیان حائل ہو گئی ہے۔ پھر یہ دیکھئے۔ محبوب کے ساتھ لپٹنے یا چھونے کا جذبہ تو مجید امجد کے ہاں پیدا ہی نہیں ہوتا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرب کی آرزو بھی محض خیال کا فاصلہ ہی ہے۔ اور اس فاصلے کو قائم رکھ کر مجید امجد نے اپنی روح کو تشنگی کا دوام عطا کرنے کی سعی کی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قرب کی اس خواہش نے مجید امجد کے ہاں دبی ہوئی آرزوؤں، سہمی سمٹی تمناؤں کی ایک جوت سی جگا دی ہے۔ ان کا سحر آگیں عکس کس طرح اشعار میں ڈھل آیا ہے،

ملاحظہ کیجیے : ؎

کانچ کی اک دیوار زمانہ آمنے سامنے ہم   نظروں سے نظروں کا بندھن جسم سے جسم جدا
سرک گیا کوئی سایہ، سمٹ گیا کوئی دور   کسی کے عکس کی پیاسی کشش سبھی بھٹی تھی

آ۔ ایک دن میرے دلِ ویراں میں بیٹھ کر
اس دشت کے سکوتِ سخن جو سے بات کر

یہ نین جلتی لوئیں، جبیں نیکیوں والے   گھنے بہشتوں کا سایہ ہیں ارضِ جاں کے لئے
ذرا شکوہِ دو عالم کے گنبدوں پہ لرز   پھر اس کے بعد تیرا فیصلہ جو تو چاہے

کیا وہ تھی جو نشیبِ افق سے مری طرف
تیری پلٹ پلٹ کے ندی کے بہاؤ سے

صاف نظر آتا ہے کہ ندی پر فطرت کی ایک گھمبیر دنیا شاعر کے اطراف و جوانب میں بکھری ہوتی ہے تو اس سے کہیں وسیع تر دنیا اس نے آباد کر رکھی ہے۔ مجید امجد کی خوبی یہ ہے کہ اس نے ان دونوں رہنماؤں کو آپس میں متصادم ہونے کا موقع نہیں دیا بلکہ وہ ان دونوں کے درمیان ربطِ باہم تلاش کرتا ہے؎۔ اور اس رشتے کو پھر سے جوڑنے کی سعی کرتا ہے جو جنت سے آدم کے اخراج کے وقت ٹوٹا تھا اور آج تک پھر نہیں جڑ سکا۔

؎ توازن کی ایک مثال "مجید امجد" (ڈاکٹر وزیر آغا)

چنانچہ مجید امجد روح کی گہرائی میں ڈوب جانا چاہتا ہے تو اس نے فطرت کے خارجی مظاہر سے بھی ٹوٹ کر پیار کیا ہے۔ اور یوں احساس شدّت کی دائرہ در دائرہ کیفیت پیدا کر کے مشینی دور کے فرد کو اپنے اطراف و جوانب سے جھانکنے اور فطرت کی بوقلموں نیرنگیوں سے اکتساب سکون کا مشورہ دیا ہے: ؎

بچا کے رکھا ہے جس کو غروب جاں کے لئے — وہ ایک صبح تو ہے سیر بوستاں کے لئے
روش روش ترائیوں میں اترتی ہوا میں آج — دو چار گام لغزشِ مستانہ چاہیئے
افق افق پہ زمانوں کی دھول سے ابھرے
طیور، نغمے، ندی، تتلیاں، گلاب کے پھول
چاندنی میں سایہ ہائے کاخ و کو میں گھومیئے — پھر کسی کو چاہنے کی آرزو میں گھومیئے؟
سحر میں نکلا ہوں مینہ میں اکیلا کس کے لئے — درخت، ابر، ہوا، بوتے ہم رہاں کے لئے
رُت بدلتے ہی چمن جو ہم صفیر، اب کے بھی کوسوں دور سے
آ کے جب اس شاخ پہ چہکے مرے دل میں بجی زنجیر دل

اہم بات یہ ہے کہ فطرت کے اس ہجوم رنگ میں بھی مجید امجد نے روشنی کی آرزو ایک دل گرفتہ وارفتگی سے کی ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس نے خلوت کی تیرگی میں جس کربناک تنہائی کا سامنا کیا ہے اس کا فطری تقاضا تھا کہ وہ اس کا مداوا خارج کے منوّر روشن اور تابناک پیش منظر

سے سے ۔ تاہم عجیب بات یہ ہے کہ روشنی کی اس بہجت آمیز دنیا میں بھی جادو ئی حیرت کے ساتھ ساتھ ایک خاص قسم "حزنیہ اداسی بھی اپنی جھلک دکھاتی ہے :ـــہ

یہ تیرگی مسلسل ہیں ایک وقفۂ نور — یہ زندگی کا طلسم عجیب کیا کہنا
ہزار قافلۂ زندگی کی تیرہ شبی — یہ روشنی سی افق کے قریب کیا کہنا

چاندنی میں سایہ ہائے کاخ وکو میں گھومیے
پھر کسی کو چاہنے کی آرزو میں گھومیے

میری سیہ شبی نے اک عمر آرزو کی — لرزے کبھی افق پر تاگا سا روشنی کا
اے تیرگیوں کی گھومتی رو، کوئی تو رسیلی صبح — اے روشنیوں کی ڈولتی لو، اک شام نشیلی شام

پلٹ پڑا ہیں شعاعوں کے چیتھڑے اوڑھے
نشیب زینۂ ایام پر عصا رکھتا

مجید امجد کی غزل سے اس کا اپنا جو کردار مرتب ہوتا ہے وہ ایک شدید دکھی انسان کا کردار ہے۔ وہ زمانے کی بیکراں وسعتوں، ان گنت ہنگاموں اور موج در موج طوفان میں کھڑا ہے۔ اور صعوبتوں کے گرداب کو اکیلے سہہ رہا ہے۔ اس کی شاعری میں ہم کا داخلہ ممنوع ہے اور اس نے اپنے لئے ہمیشہ انکسار کا صیغۂ واحد متکلم ہی استعمال کیا ہے۔ اور وہ اس پر فخر بھی کرتا ہے کہ وہ زندگی کی نا دریافت منزلوں پر اکیلا چل رہا ہے۔ اور

زندگی کے دکھ تنہا اٹھاتا ہے : ؎

دل نے ایک ایک دکھ سہا تنہا　　انجمن انجمن رہا تنہا
تیری آہٹ قدم قدم اور میں　　اس معیت میں بھی رہا تنہا
میرے ہی مانند خود نگر تنہا
ہے صراحی میں پھول نرگس کا

دوسری طرف زمانے کی دورنگی، ارباب زمانہ کی بے مہری، باہمی تعلقات کی کشیدگی، فطرت سے مسلسل گریز، سچی محبتوں اور صادق قدروں کی شکست پر شاعر ایک گہری نظر ڈالتا ہے اور ان اشک بار زمانوں کے لئے ساعت بہار کا نذرانہ تلاش کرنے کے لئے اپنے ہی من میں ڈوب جاتا ہے کہ اس کا قول ہے کہ : ؎

انہیں حقیقتِ دریا کی کیا خبر امجد
جو اپنی روح کے منجدھار میں نہیں اترے

روح کے منجدھار میں گہری اترائی دراصل اس معطر تنہائی کی تلاش ہے جس نے مجید امجد کو داخلی گہرائی، فکری بالیدگی اور معنوی عمق دیا ہے چنانچہ وہ بار بار اس تنہائی کی طرف مراجعت کرتا ہے۔ یہ تنہائی کبھی اس کو کنج ذات میں ملتی ہے کبھی کنج باغ میں اور کبھی کنج دوراں میں ؎

وہ کوئی کنج سمن پوش تھا کہ تودۂ خس　　اک آشیانہ بہر حال آشیانہ رہا

جو میرے گنج دل میں گونجتے ہیں — نہیں دیکھے وہ دنیا نے زمانے

اک پل بھر گنج دل میں وہ ٹھہرا نہ رہ نورد

اب جس کے نقش پا ہیں چمن در چمن پڑے

ہے گنج عافیت، مجھے پا کر پتہ چلا — کیا ہم بھی تھے گرد سر راہگزر میاں

گنج دوراں کو نئے اِک زاویے سے دیکھتے — جن فضاؤں میں نرالے چاند گھومیں گھومتے

ان سنگین حصاروں میں دل کا یہ جھروکا

گونجیں جس میں ٹھٹکتے قدموں کی پرچھائیں

آپ نے دیکھا کہ اس گوشہ تنہائی میں پہنچ کر مجید امجد کتنا کھِل اٹھتا ہے۔ اس کی خلوت پسندی کی انتہا یہ ہے کہ انجمن انجمن تنہا رہنے والا یہ شاعر محفلوں سے تو الگ بھی نہیں ہوتا۔ لیکن اپنے سناٹوں کو اپنے ساتھ اٹھائے پھرتا ہے:

روح کے وابستہ سناٹوں کو لے کر اپنے ساتھ

ہمہماتی محفلوں کی ہاؤ ہو میں گھومتے

مجید امجد نے اپنی ساری زندگی، کراچی، لاہور، اسلام آباد جیسے پُر شور شہروں سے دُور ساہیوال کے نسبتاً خاموش شہر میں گزاری ہے۔ کہتے ہیں اس کا تبادلہ لاہور ہو گیا تو جب تک تبادلہ منسوخ نہ ہوا مجید امجد پر جانکنی کی کیفیت طاری رہی۔

ساہیوال میں بھی اس کا نشیمن زیادہ گنجان آباد علاقے میں نہیں تھا بلکہ وہ ایک ایسی آبادی میں رہتا تھا۔ جہاں پڑوسیوں کو بھی علم نہیں ہوتا کہ ساتھ کے مکان میں کون رہتا ہے۔ چنانچہ جس رات مجید امجد نے اپنی روح کے پاتال میں سب سے گہرا غوطہ لگایا اور پھر واپس آنا ضروری نہ سمجھا اس رات بھی پڑوس میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ اس کنج مقدس سے ایک زندگی افروز خوشبو ہجرت کر گئی ہے۔ دوست بروقت پہنچے اور انہوں نے مجید امجد سے یوں وفا کی کہ اس کی فکر و نظر کے آئینہ اور شعر دشمن کے صدمے اور غموں اور دکھوں کی دستاویزیں اس کے شعری صحیفے سب کے سب یونائیٹڈ بنک کے کنج تنہائی میں میں پہنچا دیئے کہ بقول مجید امجد: ؎

اس اپنی مٹی میں جو کچھ اماں ہے مٹی ہے
جو دن ان آنکھوں نے دیکھا ہے کون دیکھے گا

مجید امجد کی ایک انفرادیت یہ ہے کہ اس نے غزل میں بیشتر اپنے آپ ہی کو مخاطب کیا ہے۔ وہ اونچے سنگھاسن پر کھڑے ہو کر بلند و بانگ

لہجے میں سامع کو مخاطب نہیں کرتا بلکہ وہ جب اپنے بے امانت دکھوں کو یاد کرتا ہے تو اتنی نرم روی برتتا ہے کہ اس کے اشعار میں زیرلبی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ احساس کے لطیف دائرے میں ایک کہانی کا تار و پود مرتب کرتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے اس کی ذات کا افسانہ ہے جس میں زمانہ بھی اپنا عکس دیکھ سکتا ہے۔ اپنی روح سے ہمکلام ہونے کی یہ کیفیت مجید امجد کے لفظوں میں نسبتاً زیادہ نمایاں ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ شاعر اپنے آپ سے ہی باتیں نہیں کر رہا بلکہ اپنی ذات کے دوسرے عکس کو بھی تجربات کے رموز نہاں سے آگاہ کر رہا ہے :-

وار دنیا نے کئے مجھ پر تو امجدؔ میں نے اس گھمسان میں
اپنا سینہ چیر کر رکھ دی نیام حرف میں شمشیر دل

امجد طریق مے میں ہے یہ احتیاط شرط
اِک داغ بھی کہیں نہ سر پیرہن پڑے

غموں کی راکھ سے امجدؔ وہ غم طلوع ہوئے
جنھیں نصیب اِک آہ سحرگہی بھی نہ تھی

ضمیر خاک میں خفتہ ہے میرا دل امجدؔ
کہ نیند مجھ کو ملی خواب رفتگاں کے لئے

مجید امجد کی غزل ایک خاص قسم کی طلسماتی فضا میں تخلیق ہوتی ہے تیرگیوں کی گھومتی رو، خندہ بلب جھونکا، شہر وفا کا بند دریچہ، بھٹکے ہوتے خیال کی موج، جلتی دھوپ میں گنگناتے کلس، دل کے برج پر

ڈولتا ہوا عکس اور ایک بسیط ویرانے میں بانسری کی مدھر لَے، یہ سب ایسی تصویریں ہیں جو ذہن میں اس طلسماتی فضا کا پورا نقش مرتب کر ڈالتی ہیں۔ ان سب کے ساتھ جب مجید امجد کی دھیمی نغمگی، لفظوں کا سحر انگیز آہنگ قافیوں کا زیر و بم، ردیفوں کا شبنمی تسلسل اور طویل بحروں کی گنگناہٹ آپس میں مل جاتی ہیں تو ایک حیرت کدہ تشکیل پا جاتا ہے جس میں داخل ہونے کے تو ہزاروں راستے ہیں لیکن نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ یہ جادو تی عنصر ان غزلوں میں خاص طور پر مسحور کرتا ہے۔ جن جن میں نسبتاً لمبی بحر میں کئی لفظوں پر مشتمل ردیفیں اور دو یا دو سے زیادہ قافیے استعمال کیے گئے ہیں:۔

ایک ایک جھروکا خندہ بلب ایک ایک گلی کہرام
ہم لب سے لگا کر جام ہوئے بدنام بہت بدنام
اک شہر وفا کر بند دریچے آنکھیں میچے سوچتے ہیں
کب قافلہ ہائے خندۂ گل کو ان راہوں سے گزرنا ہے
یہ ہر ایک سمت مسافتوں میں گندھی پڑی ہیں جو ساعتیں
تری زندگی مری زندگی، انہیں موسموں کی شمیم ہے
اک لہرائی اور ڈوب گئے ہونٹوں کے کنول آنکھوں کے دیئے
اک گونجتی آندھی وقت کی بازی جیت گئی رُت بیت گئی
بوجھل پردے، بند جھروکا، ہر سایہ ایک رنگیں دھوکا
میں اک مست ہوا کا جھونکا، دوار دوار جھانک چکا

یہ کیا سکوں ہے اس سکون میں کتنا اضطراب ہے
یہ کس کا میرے سینے پر خنک خنک ساعات ہے

ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے میر کی لمبی غزلوں کو "ادھورے گیت" کا عنوان دیا ہے[1]۔ مجید امجد کی مندرجہ بالا غزلیں بھی شاید انہیں عالمگیر "ادھورے گیتوں" کا ایک حصّہ ہیں۔ ان اشعار کی روح میں گیتوں کی رسونت موسیقی، دھیما نرم لہجہ لفظوں کے ساتھ جذبے کا زیر وبم سب کچھ سمایا ہوا ملتا ہے۔ پھر ان اشعار کے باطن سے وہ بھی جاگتا ہوا محسوس ہوتا ہے جو دل کو مٹھی میں پکڑ کر اس سے سارا خون نچوڑ لیتا ہے۔ ان غزلوں میں ہکورے لیتی ہوئی وہ ایسی روح پرور کیفیت موجود ہے جسے پا کر پھر اس سے الگ ہونے پر دل مائل نہیں ہوتا کہ یہ نغمہ ٹوٹ نہ جائے، یہ گیت بکھر نہ جائے۔

مجید امجد دو غزل کی بدلتی ہوئی روایت کا ایک اہم زاویہ ہے۔ اس نے غزل کے فنی اور فکری امکانات کا دائرہ وسیع کیا اور اس کی نشاۃ ثانیہ کو قریب لانے میں معاونت کی۔ بظاہر نظر آتا ہے کہ ناصر کاظمی کی طرح مجید امجد بھی غزل میں میر کی قلندری، بے نیازی اور درویشی کو رائج کرنے والا ہے۔ تاہم اس کی ایک یہ بات اسے معاصر شعراء سے ممتاز کرتی ہے

---

[1] تقدیر (از ڈاکٹر عبداللہ)

کہ اس نے نظم کے جدید مزاج کو غزل میں رائج کرنے کی سعی کی اور اس
کوشش میں خارج کی زندگی کے ان تمام عناصر سے فائدہ اٹھایا جو نظم میں اس
کے منفرد تجربے کا جوہر بن چکے تھے۔ چنانچہ مجید امجد نے غزل میں جو امیجری
استعمال کی ہے وہ درحقیقت نظم کی امیجری ہے۔ پھر اس نے اطراف و
جوانب کے تمام مظاہر کو سیّال صورت میں اس طرح گرفت میں لیا ہے کہ ان
سے نئے نئے استعارے اور علامتیں اور تمثالیں، تخلیق ہوتی چلی گئی ہیں۔
مجید امجد کو ان سب کے ساتھ چونکہ جذباتی، ذہنی اور فکری وابستگی تھی۔
اس لئے اس نے جس لفظ کو بھی مس کیا وہ اس کے شعری آہنگ میں پوری
طرح جذب ہوگیا۔

ہیئت کے میدان میں مجید امجد نے بعض مقبول بحروں کے ارکان میں
حذف و اضافہ کرنے کے تجربے بھی کئے۔ اسے اوزان اور بحور پر جو مکمل
عبور تھا اس کا ایک روشن زاویہ تو یہ ہے کہ اس نے غیر مروجہ بحروں
میں بھی شعر کہنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف جب اس نے لمبی بحروں کو
نغگی پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا تو موسیقی کا لہرا زیادہ دلفریب بنانے
کے لئے اس میں کہیں کہیں ارکان کا اضافہ بھی کر دیا۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

جادواں شمعوں کی قدریں بجھ گئیں تو جل اٹھی تقدیرِ دل
آج تو ہیں مٹی کے ہر ذی روح ذرّے میں بھی ہے تصویرِ دل

اپنے دل کی راکھ چن کر کاش ان لمحوں کی بہتی آگ میں
میں بھی اک سیّال شعلے کے ورق پر لکھ سکوں تفسیرِ دل

مجید امجد کی غزل اس کے شعری اظہار کی ایک اہم صنف ہے اور اس صنف کو اس نے اپنے فنّی سفر کی طویل مسافت کے وقفۂ تفریح کے لئے قبول نہیں کیا۔ بلکہ وہ اس کے گیان میں روح کے منجدھار میں بھی اترا ہے اور پھر اس نے غزل کی شاخِ محزوں پر غنوں کے گلاب کھلائے۔ ان گلابوں کی خوشبو سے ساہیوال کے دل میں کیا آئی کہ مجید امجد کو ایک کنج نا پرساں میں محبوس کر دیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب مجید امجد پھولوں کی تلاش میں روح کے سمندر میں اتر گیا اور لوٹ کر نہ آیا۔ اس کے پیچھے سناٹوں کو کندھے پر اٹھائے ایک درویش کی صدا تھی کہ اب تک ارتعاش پیدا کر رہی ہے:

تر تخ کی گرد کی تہ سے اگر کہیں کچھ پھول
کھلے بھی۔ کوئی تو دیکھے گا ــــ کون دیکھے گا
میں روز ادھر سے گزرتا ہوں، کون دیکھتا ہے
میں جب ادھر سے نہ گزروں گا ــــ کون دیکھے گا

طاہر تونسوی

سوچ کی بے حرف لو کا شاعر

اردو غزل کا ہر شعر بذاتِ خود ایک پوری نظم ہوتا ہے۔ ہر شعر میں معانی کی اتنی پرتیں پوشیدہ ہوتی ہیں کہ قاری کو ان کی تہوں تک پہنچنے کے لئے سوچ کے گہرے محل سے گزرنا پڑتا ہے۔ مجید امجد ایسا غزل گو شاعر ہے جس نے اردو غزل کو ایک سوچ عطا کی ہے۔ اس کی غزل میں ایک نیا آہنگ، نیا لب ولہجہ اور متنوع موضوعات کے استعمال کا عکس فنی رچاؤ کے ساتھ ملتا ہے۔ کائنات کی وسعتوں میں پھیلے ہوئے لاتعداد ان کہے موضوعات جن تک عام ذہنوں کی رسائی ممکن نہیں۔ مجید امجد ان تک کس طرح پہنچتے ہیں۔ یہ تو وہ خود ہی بتا سکتے تھے، مگر ان کا ہر شعر اس بات کی دلیل بن کر ابھرتا ہے کہ اس نے موضوع کا پورا گیان حاصل کر کے اسے الفاظ کا ملبوس بنایا ہے۔

کبھی تو سوچ تیرے سامنے نہیں گزرے
وہ سب سمے جو تیرے دھیان سے نہیں گزرے
بکھرتی لہروں کے ساتھ ان دنوں کے تنکے بھی
جو دل میں بہتے ہوئے رک گئے نہیں گزرے

جب اک چراغِ راہ گزر کی کرن پڑے
ہونٹوں کی لو لطیف حجابوں سے چھن پڑے
اس جلتی دھوپ میں یہ گھنے سایہ دار پیڑ
میں اپنی زندگی انہیں دے دوں جو بن پڑے

"میں" کا لفظ جب شعر میں استعمال ہوتا ہے تو اس میں ایک کائنات کی وسعت ہوتی ہے۔ مجید امجد کسی حرف یا کسی لفظ کا خالق نہیں۔ وہ لفظوں کو موضوع معنی، جذبے اور تخیل کے اعتبار سے ترتیب دیتا ہے اور اس طرح لفظ و معنی سے پیدا ہونے والی نئی کیفیت کا خالق بن کر سامنے آتا ہے۔

الفاظ معنی کی علامتیں ہوتی ہیں جنھیں شاعر کی شاعرانہ بصیرت نیا رنگ دیتی ہے۔ شاعر کی ذات تنہا نہیں رہتی۔ بلکہ معاشرے اور کائنات کا حصہ بن کر ابھرتی ہے۔ مجید امجد کی غزل کا موضوع بھی زندگی کے کرب و نشاط اور اس کے دکھ سکھ کے خمیر سے بنا ہے۔ مگر انفرادی تجربے کے باوجود اجتماعی شعور نمایاں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہر ایک کو اپنی آپ بیتی معلوم ہوتی ہے:-

روح کے دربستہ سناٹوں کو لے کر اپنے ساتھ
اور ابھی سے جلوہ زار رنگ و بو میں گھومتے
کنج دوراں کو نئے اک زاویے سے دیکھتے
جن فضاؤں میں نرالے چاند گھومیں گھومتے

مجید امجد اپنے غم کو پورے فنی شعور و آگہی کے ساتھ اجتماعیت عطا کرتا ہے اور پوری کائنات کو اپنے غم میں سمیٹ لیتا ہے۔ اور یہ دکھ اور غم پوری کائنات کے غم کے پس منظر میں ابھرتا ہے:

تیرے خیال کے پہلو سے اٹھ کر جب دیکھا
مہک رہا تھا زمانے میں چار سو ترا غم
طلوعِ مہر شگفتِ سحر سیاہیٔ شب
تری طلب تجھے پانے کی آرزو ترا غم
نگاہ اٹھی تو زمانے کے سامنے ترا روپ
پلک جھکی تو مرے دل کے روبرو ترا غم

پرانی علامتیں ایک بہت بڑا خزانہ ضرور ہیں۔ لیکن اس خزانے پر قناعت کر لینا نادانی ہے۔ کبھی تو ان کے استعمال سے بڑا حسن پیدا ہو جاتا ہے لیکن کبھی وہ خیالات اور احساسات کو جکڑ بھی لیتی ہیں اور اصلیت پر پردہ ڈال دیتی ہیں۔ کیونکہ زندگی کی نئی حقیقتیں نئے طریقِ اظہار اور اندازِ بیان کا مطالبہ کرتی ہیں۔ اس مطالبے کو مجید امجد نے نئی امیجری اور نئے استعارے استعمال کر کے پورا کیا ہے۔

تخلیقی عمل کے الیتے کو لے لیں یا سائنس کے اس کلیے کو کہ ہر چیز اپنے مرکز کی طرف لوٹتی ہے یا جسے سائنسی اصطلاح میں زمین کی کشش ثقل کہا جاتا

ہے۔ اس نظریے کو مجید امجد نے اس خوب صورتی اور جمال بیان کے ساتھ الفاظ کی لڑیوں میں پرو دیا ہے کہ اردو شاعری اس کا جواب نہیں لاسکتی۔ اور اس سے مجید امجد کے سائنسی شعور کا پتہ چلتا ہے کہ اردو غزل میں بھی سائنسی افکار بیان کئے جاسکتے ہیں : ؎

پلٹ پڑا ہیں شعاعوں کے جھیڑے اوڑھے
نشیب زینۂ ایام پر عصا رکھتا
میں دیکھتا تھا، اچانک یہ آسمان پہ گرے
بس ایک پل کو رکے اور پھر مدار میں تھے

مجھے یہ بات تسلیم کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی کہ مجید امجد واقعی اردو نظم کا بہت بڑا شاعر ہے۔ اور اس کے سامنے بہت سے قد آور شاعر بھی بونے دکھائی دینے لگے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اردو نظم کی طرف بہت توجہ دی ہے اور ہئیت کے علاوہ موضوعات کے اعتبار سے بھی نت نئے تجربے کئے ہیں مگر اردو غزل اس کی بے توجہی کا شکار رہی ہے اور اس کا غزل کا سرمایہ کم ہے۔ اتنے کم غزلیہ سرمائے کے باوجود جو موتی اس نے اردو غزل کے دامن میں ڈال دیئے ہیں۔ ان کی درخشندگی اور چمک کبھی بھی زنگ آلود نہیں ہوسکتی اور اس کی غزل کے اکثر اشعار بڑے شاعروں کے دیوانوں پر بھاری ہیں۔ اسلوب کے لحاظ سے بھی اور لفظ و معنی کے اعتبار

سے بھی۔ مجید امجد نے اسے مختلف انواع اور اُن کے موضوعات اردو غزل میں سموتے ہیں کہ اس کے علاوہ دوسروں کی ہواتے خیال بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ ہجر وصال اور درد و فراق کا موضوع اردو غزل کے لئے نیا نہیں مگر نئی معنویت کے ساتھ جب یہ مجید امجد کی غزل میں در آتا ہے تو حرف و صوت اور الفاظ و معنی کے نئے شگوفے کھلتے ہیں۔ نازک خیالیوں کی نئی نویلی کلیاں وجود میں آتی ہیں اور مجید امجد کی غزل کی دنیا کیوٹوے کا بَن معلوم ہوتی ہے جس میں بے پناہ خوشبو بھی ہے۔ نوکیلے کانٹے بھی ہیں اور خوبصورت زہریلے سانپ بھی: ؎

غموں کے سبز تبسّم سے کنج مہکے ہیں
سمے کے سم کے ثمر ہیں مَیں اور کیا رکھتا
ہوا کے سایوں میں ہجر اور ہجرتوں کے وہ خواب
میں کاش دل میں وہ سب منزلیں سجا رکھتا

وقت مجید امجد کے ہاں ایک اہم FACTOR کے تناظر میں اجاگر ہوتا ہے۔ گزرتے لمحوں میں پناہ تلاش کرنے کی بجائے مجید امجد لمحہ وجود اور پھر لمحہ فردا کا متلاشی رہتا ہے۔ وہ بیتی رتوں کی کہانیاں ضرور بیان کرتا ہے کہ روایت یہی ہے اور ان سے رابطہ ہونا بھی چاہیئے۔ مگر روایت سے وہ اس طرح بغاوت کرتا ہے کہ کائنات کی وسعتوں میں لمحۂ فردا کا سراغ لگانے

کی جستجو کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی آنکھیں ان بیتے دنوں کی منتظر ہیں۔ اور وہ اس خاص دن کو بھی جو سورج کی راکھ میں غلطاں ہے۔ انہی دنوں کی تہوں سے نکال کر دیکھنے کا متمنی ہے :-

اس ایک دن کو۔ جو ہے عمر کے زوال کا دن
اسی بدن میں نمویاب کون دیکھے گا
یہ ایک سانس جھیلوں بھری جگنوں میں رچی
اس اپنی سانس میں کون اپنا انت دیکھے گا

مجید امجد یہاں تنہائی اور اداسی کے گمبھیر ماحول میں دبی ہوئی راکھ سے چنگاری تلاش کرتا ہے۔ مگر یاسیت اور رجائیت کے ملے جلے اظہار کے ساتھ :-

ہزار چہرے خود آرا ہیں کون جھانکے گا
مرے نہ ہونے کی ہونی کو کون دیکھے گا
تڑخ کے گرد کی رو سے اگر کہیں کچھ پھول
کھلے بھی۔ کوئی تو دیکھے گا۔ کون دیکھے گا

اس طرح مجید امجد اپنی غزل میں سوچ کی بے حرف لویں جلاتا اور الفاظ کا تیل استعمال کر کے انہیں جلا بخشتا ہے۔ یہاں مایوسیاں، تنہائیاں اور اداسیاں بھی اس کا گھیراؤ کرتی ہیں۔ مگر وہ ان میں ڈوب کر بھی باہر

نکل آتا ہے۔ پت جھڑ کے اداس اور بے رنگ موسموں کی گرد بھی اس کے چہرے پر دکھائی نہیں دیتی بلکہ وہ شگفتگی کے گلاب کھلاتا ہوا اردو غزل کو مسرت اور شادمانی کے ہفت رنگ موسموں کا سندیسہ دیتا ہے اور یوں انسانی حوالے سے زمین و آسمان اس کے ہاں ایک افق پر ملتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور پھر وہ غزل کو ابدی لہجے عطا کر کے خود اسی مٹی میں رچ بس جاتا ہے۔ جس کی خوشبو اس کے سارے بدن میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور جس کے چند جھونکوں نے اردو غزل کے آنچل کو لہرا کر گلی گلی اور نگر نگر آوارہ کر دیا ہے۔ اور وہ صدائیں ابھرتی رہی ہے :سہ

بنے یہ زہر ہی وجہ شفا جو تو چاہے
خرید لوں میں یہ نقلی دوا جو تو چاہے
یہ زرد پنکھڑیاں جن پہ حرف حرف ہوں میں
ہوائے شام میں مہکیں ذرا جو تو چاہے
تجھے تو علم ہے کیوں میں نے اس طرح چاہا
جو تو نے یوں نہیں چاہا تو کیا جو تو چاہے

اور یوں اردو غزل کو ایک نیا آہنگ دے کر مجید امجد ہمیشہ کے لئے امر ہو گیا اور اس کی یہ بشارت صداقتوں کی آئینہ دار ہے کہ :سہ

کٹی ہے عمر بہاروں کے سوگ میں امجد   مری لحد پہ کھلیں جاوداں گلاب کے پھول

اور آج اُس کے مرقد پر سدا بہار تر و تازگی لئے ہوئے گلاب کے پھول کھلے ہیں۔ وہ مر کر بھی زندہ ہے اور اُس کی غزل اسے کبھی بھی مرنے نہیں دے گی۔ مگر کون جانے ـــــ شاید وقت اس بات کی ضمانت دے ـــــ کیونکہ وہی میزانِ عدل ٹھہرا ہے۔

بلراج کومل

مجید امجد — ایک مطالعہ

مجید امجد کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے اکثر اس چینی تیر انداز کی یاد آتی ہے جس نے فنِ تیر اندازی کی معراج اس وقت حاصل کی جب اس نے تیر و ترکش سے نجات حاصل کرلی۔ مجید امجد آغازِ سفر میں روایتی مسافر کی طرح ساز و ساماں سے لیس نظر آتے ہیں لیکن جوں جوں وہ اپنی منزل کے قریب پہنچتے گئے وہ ساز و سامان کے تکلف سے ماورا چلے گئے۔ جسمِ خاکی سے آزاد ہونے کے بعد وہ اس دوام کا حصہ بن گئے جس کا نغمۂ سرمدی وہ ایک زمانے سے سُن رہے تھے۔

"شبِ رفتہ" او زمیرے خدا میرے دلؔ کے صفحات کی سیاحت کرتے وقت میں ان گنت تنوّع اور مختلف دنیاؤں سے گزرا ہوں جن کی تخلیق کرنا اور پھر ان سے ماورا جانا مجید امجد کا نصب العین تھا۔ شبِ رفتہ اور میرے خدا میرے دل کا شاعر خالص عمومی سطح پر معاشرے کا پیدا کیا ہوا عام انسان ہے۔ اس لئے وہ دورانِ سفر کئی بار صرف جسمانی اور ارضی سطح پر اس عام انسان کی باتیں کرتا ہے جو یا تو وہ خود ہے یا اس کا

ہم عصر شہری ہے۔ مروجہ ادبی اصطلاح کے مطابق یہ رویّہ ترقی پسندانہ امکانات کا حامل ہے۔ لیکن چونکہ میں مجید امجد کے کلام کا یہ مطالعہ تقسیم ادوار اور مستعمل اصطلاحات سے آزاد رکھنا چاہتا ہوں۔ اس لئے میں مجید امجد کے کلام کے سماجی پہلوؤں کا ذکر بالکل سادہ الفاظ میں کروں گا۔

مجید امجد جس معاشرے میں پیدا ہوتے، پلے بڑھے جوان ہوئے اور حدودِ حیات و مرگ کے پار چلے گئے۔ غلاظتوں اور ناہمواریوں کا معاشرہ تھا۔ اس میں اندرونی اور خارجی جبر و استبداد بھی تھا اور استحصال بھی۔ اس لئے مجید امجد کے کلام کی ایک واضح سطح ایک ایسے حساس انسان کے ردِّ عمل کی سطح ہے جو زندگی کے مظاہر کی ارضی تفصیلات روز و شب بغور دیکھتا ہے۔ لیکن ان خراشوں اور زخموں کو دیکھ کر اُداس ہو جاتا ہے جن سے ان کے معاشرے کے زیادہ تر چہرے ملوّث ہیں۔ مجید امجد اپنے گرد و نواح کے پورے ماحول کی جزیات سے واقف ہیں۔ وہ اس کے در و دیوار، چھوٹی گلیوں، بازاروں، میلوں کو ایک قریبی دوست کی طرح جانتے ہیں اور ان کو اپنی شخصیت کا جزو لاینفک تصور کرتے ہیں۔ لیکن ایک مجروح چہرہ بار بار ان کے سامنے ابھرتا ہے اور ان کی اداسی کو گہرا کر دیتا ہے۔ خدا (ایک اچھوت ماں کا تصور)، جہان قیصر و جم، جاروب کش، بارکش، ہوٹل میں، ایک فلم دیکھ کر، ایکٹریس کا کنٹریکٹ، وطن، کھوکھلے پن،

دو غلے اخلاق اور استحصال کی نقاب کشائی کرنے والی وہ نظمیں ہیں جو اگرچہ مجید امجد کے کلام کی (MAIN STREAM) کے مقابلہ میں باعتبار نوعیت اور فنی معیار کے نقطۂ نظر سے کسی قدر سپاٹ اور ہلکی ہیں۔ لیکن بہر حال قابل توجہ ہیں۔ ان کو نظر میں رکھنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ جس زینے پر پاؤں رکھ کر ہمیں منزل ارفع تک پہنچنا ہے۔ یہ بظاہر کھردری نظمیں ہی اسی کا پہلا حصّہ ہیں۔ مجھے یہاں یہ بات کہنے میں بھی کوئی تامل نہیں ہے کہ اگر مجید امجد اپنے آپ کو اس کھردری اور مفید سطح تک ہی محدود رکھتے تو اس رفعتِ مقام سے بہت دُور رہ جاتے جو اب ان کے دوام کا ضامن ہے۔

مجید امجد کے کلام کی سماجی اور معاشرتی سطح پر ادراکِ حقیقت، کرب احساس اور جذبۂ بغاوت سبھی جہتیں موجود ہیں۔ بعض اوقات کھُلے الفاظ میں، بعض اوقات اشاروں کی شکل میں، بنیادی وصف جذبۂ ہمدردی ہے جو ان سب جہتوں کو منوّر کرتا ہے:

یہ محلوں، یہ تختوں، یہ تاجوں کی دُنیا
گناہوں میں لتھڑے رواجوں کی دُنیا
محبّت کے دشمن، سماجوں کی دُنیا

یہاں پر کلی دل کی کھلتی نہیں ہے
کوئی چق دریچوں کی ہلتی نہیں ہے
میرے عشق کو بھیک ملتی نہیں ہے

اگر میں خدا اس زمانے کا ہوتا
تو عنواں کچھ اور اس فسانے کا ہوتا
عجب لطف دنیا میں آنے کا ہوتا

(شاعر)

نظم شاعر کے مندرجہ بالا تین بند کھردرے انداز میں ادراکِ حقیقت، ذہب احساس اور جذبۂ بغاوت، تینوں جہتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں (پہلے بند کے تین مصرعے ایک مشہور ترقی پسند شاعر کے ہاں ہو بہو موجود ہیں) ان جہتوں کے مظاہر دیگر نظموں میں کچھ اس طرح ہیں :-

سیلِ زماں کے ایک تھپیڑے کی دیر ہے
یہ ہات جھرلوں بھرے مرجھاتے ہات جو
سینوں میں اٹکے تیروں سے رستے لہو کے جام
بھر بھر کے دے رہے ہیں تمہارے غرور کو
یہ ہات گلبنِ ہستی کی ٹہنیاں

اے کاش انہیں بہار کا جھونکا نصیب ہو
ممکن نہیں کہ ان کی گرفتِ پنہاں سے تم
تا دیر اپنی ساعدِ نازک بچا سکو
تم نے فصیلِ قصر کے رخنوں میں بھر تو لیں
ہم بے کسوں کی ہڈیاں لیکن یہ جان لو
اے وارثانِ طرہ طرف کلاہ کے
سیلِ زماں کے ایک تھپیڑے کی دیر ہے

(درسِ ایام)

تو اگر چاہے تو ان تلخ و سیہ راہوں پر
جا بجا اتنی تڑپتی ہوئی دنیاؤں میں
اتنے غم بکھرے پڑے ہیں کہ جنہیں تیری حیات
قوتِ یک شب کے تقدس میں سمو سکتی ہے
کاش تو جیلہ' جاروب کے پر نوچ سکے
کاش تو سوچ سکے ، سوچ سکے

(جاروب کش)

مندرجہ بالا اقتباسات کس حد تک سپاٹ ہیں لیکن مجید امجد کی رُوح تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ان کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

مجید امجد بہت جلد ادراکِ حقیقت اور کربِ احساس کے سلسلے سے گزرنے کے بعد حسنِ امکان کا جہانِ روشن تخلیق کرتے ہیں۔ یہ اس سلسلے کا آغازِ سفر ہے جو معاشرے کی ناہمواریوں کے کرب سے گزرنے کے بعد مستقبل کا خواب دیکھنے کی راہ گزر پر چل نکلتا ہے۔

اس یخ کدہ یقینِ غم میں
دیکھو یہ شگفتہ دِل شگوفے
ماحول نہ کائنات ان کی
ایک نارِ نمو، حیات ان کی

عمر اِن کی بس ایک پل ہے لیکن
آئیں گے انہی کی راکھ سے کل
ماتھے پہ حسیں تلک لگائے
پھولوں بھری صبحِ نو کے سائے (پیش رو)

طویل تاریکیوں میں کھو جائیں گے اِک دن
ہمارے سائے
ٔس اپنی دنیا کی لاش اٹھائے

تو سیلِ دوراں
کی کوئی موجِ حیات ساماں
فروغِ فردا
کا رُخ پہ ڈالے مہین پردا
اچھل کے شاید
سمیٹ لے زندگی کی سرحد
کے اُس کنارے
یہ گھومتے عالموں کے دھارے
(نثرادِ نو)

یہی کھُردری سطح کے مقابلہ میں مستقبل کا خواب دیکھنے کی یہ سطح لب ولہجہ کے اعتبار سے شاعرانہ حدود میں داخل ہوجاتی ہے۔ نئے امکان کی مملکت میں قدم رکھتی ہے اور پھولوں کی پلٹن میں شامل ہوجاتی ہے، ان خوابوں کی ہم سفر بن جاتی ہے جو دیکھے تو راہ گزر پر کھڑے تماشائیوں نے تھے۔ لیکن جن کی تعبیر وہ بچے ہیں جو اُجلے پھولوں کی پلٹن میں چل رہے ہیں۔

بچّو! ہم ان اینٹوں کے ہم عصر ہیں جن پر تم چلتے ہو
صبح کی ٹھنڈی دھوپ میں بہتی آج تمہاری اِک اِک صف کی وردی
ایک نئی تقدیر کا پہناوا ہے
اُجلے اُجلے پھولوں کی پلٹن میں چلنے والو

تمہیں خبر ہے، اس فٹ پاتھ سے تم کو دیکھنے والے
اب وہ لوگ ہیں جن کا بچپن
ان خوابوں میں گزرا تھا جو آج تمہاری زندگیاں ہیں۔

(پھولوں کی پلٹن)

سطور بالا میں، مَیں نے مجید امجد کی فکر کے جن پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے ان کو مجید امجد کے اکثر ہمدرد نقاد اس لئے نظر انداز کر دیتے ہیں کیونکہ وہ مجید امجد کی اُداسی، تنہائی، افسردہ دلی اور قنوطیت کو ان کی شاعری کے قطعی نتائج کے طور پر قبول کر چکے ہیں اور وہ مجید امجد کو ان خصائص سے ٹھیک اس طرح الگ نہیں کر سکتے جس طرح وہ مندرجہ بالا کھُردرے سپاٹ لیکن اُجلے پہلوؤں کو مجید امجد کے ساتھ منسلک نہیں کر سکتے۔ مجید امجد ارضی زندگی کے قریب ہی سے اخذ نور کرتے ہیں۔ وہ ہمارے شہروں، قصبوں اور دیہات سے روز و شب گزرتے ہیں۔ وہ گلیوں، بازاروں، گھروں، چھتوں ممٹیوں، پہاڑوں اور میدانوں اور ان کے درمیان سانس لیتے ہوتے انسانوں کو قریب سے دیکھتے ہیں اور ان کی دھڑکنیں سنتے ہیں۔ ہری بھری فصلوں کے نغمہ ساز ہیں۔ وہ جسم و جان کی سبھی ارضی ضرورتوں کو محسوس کرتے ہیں اور جسمانی جبلتوں کے تجربات سے گزرتے ہیں۔ انساں سے انساں کے رشتے میں وہ لمحہ فانی بھی تلاش کرتے ہیں جو لذت کا سرچشمہ ہے۔ وہ ہوس اور

جنسی تعلقات سے متنفر یا گریز پا نہیں ہیں۔ وہ لمحہ موجود سے اکتساب لطف و لذّت کرنے کے فن سے واقف ہیں۔

ہری بھری فصلو
جگ جگ جیو پھلو
ہم تو ہیں بس دو گھڑیوں کو اس جگ کے مہمان
تم سے ہے اس دیس کی شوبھا اس دھرتی کا مان
دیس بھی ایسا دیس کہ جس کے سینے کے ارمان
آنے والی ست رُتوں کے ہونٹوں پہ مُسکان
جھکتے ڈنٹھل، پکتے بالے، دھوپ پچے کھلیان

شہر شہر اور بستی بستی جیون سنگ بسو
چندن روپ سجو
دامن دامن پلو پلو، جھولی جھولی ہنسو
ہری بھری فصلو
جگ جگ جیو پھلو (ہری بھری فصلو)
صدا خفیف سی دستک سے ملتی جلتی ہوتی
اور اس کے بعد کوئی چٹخنی سی کھلتی ہوتی

ہوا کے نرم جھکولوں میں سرسراہٹ سی
گلی کے کونے پہ باتیں سی، کھلکھلاہٹ سی　　(گلی کا چراغ)
نگہ جن پہ پھسلے، وہ شانے وہ باہیں
مدوّر اٹھانیں، منوّر ڈھلانیں
ہر اک نقش میں زیست کی تازگی ہے
ہر اک رنگ سے کھولتی آرزوؤں کی آنچ آرہی ہے
(برہنہ)

لیکن لمحۂ وجود اور صہباتے امروز کے نزدیک محض ہنگامۂ جشن امروز کا بہانہ نہیں ہے۔ جوں جوں ہم مجید امجد کے قریب پہنچتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ کاروبارِ زندگی اور سیل ہاؤ ہو کے درمیان کسی پُر اسرار شبیہہ، کسی انجانے اجنبی پیکر، کسی گمنام چہرے، کسی مسحورکن آواز کی تلاش میں ہیں اور بار بار محسوس کرتے ہیں کہ انہیں کسی پُر اسرار، اجنبی پیکر کسی گمنام چہرے، کسی دور کی آواز کے ساتھ ہم کلام ہونا ہے۔ یہاں سے ہم حقیقی مجید امجد کے گرد و نواح میں پہنچتے ہیں اور ان کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ہماری طرف دیکھتے ہیں لیکن ہمارے ہی چہروں اور پیکروں میں کسی اجنبی چہرے اور پیکر کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ مثالی چہرہ انسان کا چہرہ ہے یا خدا کا جلوۂ شب تاب۔ ہم بار بار غور کرتے ہیں۔ لیکن مجید امجد اپنی ازلی اور ابدی جستجو اور سیاحت کے سفر میں

آسانی سے ہم کو راز دار نہیں بنانا چاہتے ہیں اس لئے وہ اپنی تنہائی کا زہر مکمل طور پر اپنے رگ وپے میں جذب کر لیتے ہیں۔ لمحۂ امروز اور لمحۂ جاوداں کے سنگم پر جو نوریں ہالے شبیہیں، آوازیں، چہرے اور پیکر ان کے سامنے ابھرتے ہیں، ان کی تفصیل کچھ اس قسم کی ہے:

کس کا چہرہ ہے کہیں ان گھونگھٹوں کے درمیان
چوڑیوں والی کلائی، جھومروں والی جبیں
میٹوں پر سے پھسلتا ہی نہیں کنکر کوئی
کون ہے موجود جو موجود بھی شاید نہیں

——— (ایک پُرنشاط جلوس کے ساتھ)

بیتے لمحوں کی بجھتی مشعلوں سے پھوٹ کر
تیرتی پھرتی ہے حرفِ آرزو کی نغمگی
سرد ہونٹوں پر کبھی، مخمور آنکھوں میں کبھی
کالے کالے بادلوں کے دیس سے آتی ہوئی
رقص کی زنجیر کے سرگم سے ٹکراتی ہوئی

———

(جبر و اختیار)

کوئی دم توڑتی صدیوں کے گرتے چوکھٹوں سے جھانکتا چہرہ
زمینوں، آسمانوں کی دہکتی گرد میں لتھڑے

خنک ہونٹوں سے یوں پیوست ہے اَب بھی
ابھی جیسے سحر بستی پہ جلتی دھوپ کی مایا انڈیلے گی

(دوام)

ریتلے ٹیلوں کی ڈھلوانوں کے پار
وہ رہا، میرا نشیمن، دُور اُدھر
کھیلتا ہے جس کے در و بام کے ساتھ
ٹیکری سے دُور ادھر اِک نور ادھر
نوُر اِک رنگیں دھوئیں کی طرح نوُر
روشنی اِک گُل بداماں روشنی

(دُور کے پیڑ)

ابھی تو جلتی حدوں کی حدیں ہیں لامحدود
ابھی تو اس میرے سینے کے ایک گوشے میں
کہیں لہو کے تریڑوں میں بَرگ بَرگ پہ اِک
کوئی لرزتا جزیرہ سا تیرتا ہے جہاں
ہر اِک طلب تیری دھڑکن میں ڈوب جاتی ہے
ہر اِک صدا ہے کوئی دُور کی صدا

مرے دِل

مرے خدا مرے دل

مرے خدا مرے دل

اگر مجید امجد کی تلاش صرف ایک شبیہہ، ایک چہرہ، ایک روشنی، ایک آواز تک محدود ہوتی تو صوفی شعرا کی طرح ان کو ان کا محبوب مل جاتا، اس کے چہرے میں خدا کا جلوہ دیکھتے اور میرا کی طرح اپنے شیام کے متوالے ہو کر اپنی منزل پالیتے۔ لیکن مجید امجد لمحۂ امروز کے ساحل پر صرف آوازوں، چہروں اور پیکروں کی تلاش نہیں کرتے۔ وہ تو اس مقام سے بھی ماورا جانا چاہتے ہیں۔ اس موجِ بے پایاں کے حصول کے لئے وہ آوازوں، شبیہوں چہروں اور پیکروں کے محتاج نہیں ہیں۔ وہ ترسیلِ حقیقی سے سرشار ہونا چاہتے ہیں۔ یہ ترسیلِ حقیقی ساحلِ امروز پر نہ تو انسانوں کے درمیان نظر آتی ہے اور نہ ہی انسان اور فطرت کے درمیان، نقطۂ اتصال یا تو پیدا ہی نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو آناً فاناً منہدم ہو جاتا ہے۔ جوہرِ زیست مظاہرِ زیست سے ارفع تر اور وسیع تر ہے اور اس سے تعلق پیدا کئے بغیر انسان نورِ حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتا۔ ہنگامِ طلوعِ فرض اور سیلِ روز و شب میں انسان حقیقی تعلق سے محروم ہو جاتا ہے۔ عظیم رشتہ اس حقیقت اس حسن سے ہے جو آنکھ کو نظر آنے والے مظاہر سے ماورا ہے۔ لمحۂ امن دو مخالف لشکروں کے درمیان ہے۔ اس لئے اس کا حصول

مشکل ترین کام ہے۔

مجید امجد بار بار لحۂ امروز کی حدود کو پھلانگ جاتے ہیں اور بار بار اجنبی انجانی بیکراں دنیاؤں کی سیاحت کرتے ہیں جس سے ہم خاکی کاروبارِ زندگی کے درمیان اکثر محروم ہوتے ہیں۔

اور اک نغمۂ سرمدی کان میں آرہا ہے مسلسل کنواں چل رہا ہے
پیاپے مگر نرم رو اس کی پیہم مگر بے تکان اس کی گردش
عدم سے ازل تک ازل سے ابد تک بدلتی نہیں ایک آن اس کی گردش
نہ جانے لئے اپنے دولاب کی آستینوں میں کتنے جہان اس کی گردش
رواں ہے رواں ہے
طپاں ہے طپاں ہے
یہ چکر یونہی جاوداں چل رہا ہے
کنواں چل رہا ہے

(کنواں)

وہ صہباتے امروز سے سرشار ہیں۔ لیکن اس نظر کے متلاشی ہیں جو نظروں کی زد سے باہر ہے: ؎

یہ صہباتے امروز جو صبح کی شاہزادی کی مست انکھڑیوں سے ٹپک کر
بہ دورِ حیات آگئی، یہ ننھی سی چڑیاں جو چھت میں چہکنے لگی ہیں

ہوا کا یہ جھونکا جو میرے دریچے میں تُلسی کی ٹہنی کو لرزا گیا ہے
پڑوسن کے آنگن میں پانی کے نلکے پہ یہ چوڑیاں جو چھنکنے لگی ہیں
یہ دنیائے امروز میری ہے میرے دلِ زار کی دھڑکنوں کی امیں ہے
یہ اشکوں سے شاداب دو چار صبحیں، یہ آہوں سے معمور دو چار شامیں
انہیں چلمنوں سے مجھے دیکھنا ہے وہ جو کچھ نظروں کی زد میں نہیں ہے

(امروز)

نظروں کی زد سے باہر کے منظر کی جھلکیاں دیکھنے کے لئے مجید امجد بار بار جست لگاتے ہیں اور پابہ گل اور فرشِ خاک پر ہونے کے باوجود اس نورِ حقیقت تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں جو الفاظ کے سلاسل سے ماورا ہے۔ دِل کے بے آواز جزیرے میں وہ بار بار جس اجنبی کو دعوتِ ملاقات دے رہے ہیں، وہ ماورائی خصائص کا ہیولا ہونے کے باوجود ان کو بے حد عزیز ہے۔

دل کے بے آواز جزیرے میں چھُپ چھُپ کے چپکے چپکے
آنے والو کیوں چھپتے ہو، گھونگھٹ کھولو ہنس ہنس بولو
اب تک ہم نے سنوارے نکھارے منزل منزل رستے رستے
خوابوں کے مسحور خرابوں میں ارمانوں کے گل دستے
اسی مٹی کے گھروندے میں ہی اک دن بیٹھ کے ہنستے ہنستے

اپنے ہات سے میری چائے کی پیالی میں چینی گھولو

(بہ فرش خاک)

سیاق وسباق مکمل طور پر ارضی ہیں لیکن مطلوبہ مہمان سراما ورائی کیفیات لئے ہوتے ہے۔ ارضی سیاق وسباق میں مجید امجد کا سفر بعض اوقات ایسے جزیروں میں بھی ہوتا ہے۔ جہاں شدید تنہائی اور احساسِ زیاں حکمران ہے۔ "آٹوگراف" اور "توسیعِ شہر" (توسیعِ شہر ہاپکنز کی نظم (BINSEYPOPLARS) کی یاد دلاتی ہے) میں شاعر لمحہ بھر کے لئے تسلسل سے منقطع ہوجاتا ہے تو شدید کرب کی فضا پیدا ہوجاتی ہے۔ آٹوگراف میں شاعر معاشرے کی معکوس اقدار کی وجہ سے جو فن کار تخلیق کار کو کھلاڑی سے کم قرار دیتی ہیں اور توسیعِ شہر میں اس میکانکی عمل کی توسیع کی وجہ سے جو انہدام حسن کا موجب ہے۔ شاعر کی ذات ان دونوں نظموں میں محض فرد کی ذات نہیں ہے۔ بلکہ حسنِ تہذیب اور صداقت کا علامیہ ہے۔ انہدام کا عمل فروغِ تہذیب کا ہم سفر ہے۔ لیکن اس میں فن کار کا قتل شاید لازمی ہے۔ یہ ایک انسان کی انا یا اس کے جسم کا قتل نہیں۔ بلکہ ایک جوہر ایک قدر کا قتل اور انہدام ہے۔ شاعر اور حساس انسان کے لئے کون سے رشتے باقی رہ جاتے ہیں۔ سمجھوتہ، بغاوت، خودکشی، تلاشِ مستقل کا کرب، حیاتِ جاوداں کی تلاش، حقیقت بے پایاں کا ادراک۔ یہ ستم افسردہ دلی

برگشتگی، تنہائی اور قنوطیت کا نہیں ہے جس کو قابل قبول بنانے کے لئے کچھ نقادوں نے ازلی غم کا نام دے دیا ہے۔ اگر معاملہ یہیں تک محدود ہوتا تو مجید امجد، خدا، خود کشی، جاروب کش، جہان قیصر وجم آٹوگراف اور توسیع شہر (اگرچہ آٹوگراف اور توسیع شہر، مجید امجد کی منفرد اور عظیم نظمیں ہیں) سے ماورانہ جا سکتے۔ وہ صرف ایسا شاعر بننے پر اکتفا کر لیتے جو سمجھوتے اور بغاوت کے درمیان کی محفوظ کڑھی بن کر رہ جاتے ہیں جیسا ہمارے اکثر افادیت پسند شاعروں اور ادیبوں کی ذاتی زندگیوں اور ادبی کاوشوں میں ہوتا ہے۔ لیکن مجید امجد آغاز سفر سے زندگی کے جوہر حقیقی کی تلاش میں تھے۔ ہر منزل ان کے لئے ایسا سنگ میل تھی جو نئی منزلوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ زندگی کی سماجی اور معاشرتی وابستگیوں کا احترام کرتے ہوتے بھی اس کی بیکرانی اور لامحدودیت اپنے پورے وجود میں محسوس کرتے ہیں اس لئے وہ سلطنت غم اور اقلیم طرب دونوں سے آزاد ہو جاتے ہیں اور اس لازوال شعور اور احساس تسلسل سے منوّر ہو جاتے ہیں جسے کسی رسمی اصطلاح کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ کتابی علم اور کتابی اخلاق کے سنگلاخ ضبط سے آزادی حاصل کرنا ہر معاشرتی انسانی اکائی کے بس کا روگ نہیں ہے۔ مجید امجد اپنی منزل کے قریب پہنچتے پہنچتے یہ آزادی بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ مجید امجد

کے ہاں حیات و موت، یاس و امید اور کرب و نشاط الگ الگ خانوں میں بٹی ہوئی حقیقتیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی سلسلہ ہیں۔ ایک ہی زنجیر تسلسل ہیں۔

نہ کوئی سلطنت غم ہے نہ اقلیم طرب
زندگی ہی فقط آئینِ جہاں باقی ہے

——— (نہ کوئی سلطنت غم نہ اقلیم طرب)

امجد نشاط زیست اسی کش مکش میں ہے
مرنے کا عزم جینے کا قصد ایک ساتھ کر

مجید امجد نے اپنے دردِ دل کا ذکر اکثر نظموں میں کیا ہے لیکن جس بھرپور انداز میں یہ ذکر "دل دریا سمندر روں ڈونگھے" اور "زندگی اے زندگی" میں ملتا ہے۔ اس کی کوئی اور مثال ان کے پورے کلام میں مشکل سے ملے گی۔ ساحلِ امروز پر نظر آنے والے خوش رنگ چہروں کے درمیان بار بار ان کو وہ سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں جو اپنے اندر رموز زیست کے نایاب جوہر چھپائے ہوتے تھے۔ مجید امجد تشنہ لب، تشنہ گوش، تشنہ دل مسافر کی طرح بار بار یہ سرگوشیاں سنتے ہیں اور مسحور ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے پورے سفر میں وہ طاقت اپنے اندر مجتمع کرنے کی فکر میں ہیں جس سے وہ فیصلہ کن جست لگا سکیں۔ 'دل دریا سمندروں ڈونگھے' کا کون" وہ خود ہیں اور بار بار سوال پوچھنے کے بعد دل ہی دل میں اندھیری گھاٹیوں کے

پار جانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔

اتنی آنکھیں اتنے ماتھے، اتنے ہونٹ
چشمکیں، تیور، تبسم، قہقہے
اس قدر غمّاز، اتنے ترجمان
اور پھر بھی لاکھ پیغام ان کہے
لاکھ اشارے جو ہیں ان بوجھے ابھی
لاکھ باتیں ہیں جو گویائی سے دور
دور دل کی کنج ناموجود میں
روز و شب، موجود، پیچاں ناصبور
کون اندھیری گھاٹیوں کو پھاند کر
جاتے ان پُر شور سناٹوں کے پار
گونجتے ہیں لاکھ سندیسے جہاں
کان سُن سکتے نہیں جس کی پکار

—— (دل دریا سمندروں ڈونگھے)

نورِ حقیقی، نگارِ دلستاں سے وہ بہر صورت ملاقات کے متمنّی ہیں اور اس ملاقات کے لئے وہ سیلِ بے اماں کو بھی دعوت دینے کو تیار ہیں۔

کتنے سائے محوِ رقص
تیرے سر درکے پردۂ گلِ فام پر
کتنے سائے کتنے عکس
کتنے پیکر محوِ رقص
اور اِک تو کہنیاں ٹیکے خمِ ایام پر
ہونٹ رکھ کر جام پر
سن رہی ہے ناچتی صدیوں کا آہنگ قدم
جاوداں، خوشیوں کی بجتی گنگھڑی کے زیر و بم
آنچلوں کی جھنجھناہٹ، پائلوں کی چھم چھم
اس طرف باہر سرکوتے عدم
ایک طوفان، ایک سیلِ بے اماں
ڈوبنے کو ہے میرے شام و سحر کی کشتیاں

اے نگارِ دل ستاں
اپنی نٹ کھٹ انکھڑیوں سے میری جانب جھانک بھی
زندگی اے زندگی

———

(زندگی اے زندگی)

مجید امجد کی دورِ آخر کی نظموں میں وہی جست اور اس کے خطرات کی تصویرکشی ہے جس کی تیاری میں وہ عمر بھر مصروف رہے۔ روتیوں، عادتوں، اصولوں، تنظیموں اور وابستگیوں کی زنجیریں بڑی مضبوط تھیں۔ اس لئے شروع شروع میں انہوں نے باضابطہ شہری کی طرح انہیں قبول کیا۔ پھر ان کے خلاف اظہارِ شک وشبہہ کیا۔ پھر ان کو توڑ تاڑ کر پھینک دیا اور بالآخر جست لگا کر حدود کون ومکان کے ماورا چلے گئے۔ جستِ مرگ ان کی آخری جست تھی اور اس عمل کی آخری منزل جو بہت پہلے شروع ہوچکا تھا۔ وہ تسلسل کے اس دریا کا حصہ بننا چاہتے تھے جو انہیں بہت عزیز تھا۔

جو بھی پہلے دریا سے اپنا چلو بھرلے یہ دریا اس کا ہے۔
اپنی سب پاکیزگیوں کے ساتھ اس کا ہے
چاہے اس پانی میں جیسے بھی جوہر ہوں
اچھے بُرے جوہر جو دریا کی سیال حقیقت میں ایک ساتھ پنپ کر
بُجھ کر تپ کر یوں ظاہر ہیں سب ظاہر ہیں
جن کی پیاس کو اس پانی پر حق ہو
اسے بھلا کیوں شک ہو کر ان خطروں میں مقیّد ہیں وہ جوہر جو جیّد ہیں
(گدلے پانی)

جن کے خیال سے میں جیتا ہوں

تب میری پلکوں کے سایوں میں وہ روحیں سب ایک ساتھ اکٹھی
کشاں کشاں اس کوشش کے محور میں آجانے کا جتن کرتی ہیں
جس کی کشش سے سب دریا چڑھتے ہیں
کالے بادل، میرے ڈر کو جانچ اور اپنے دخانوں ہی میں بکھر کے گزر جا
ان دریاؤں سے اپنے سایوں کا بوجھ ہٹالے
ان دریاؤں کو بہنے دے جن میں میرے خیالوں کے یہ دھارے لہراتے ہیں
دھوپ ان پانیوں پر پھیلے گی تو وہ جزیرے چمکیلے، چکیں گے
جو میری آنکھوں میں بسنے والے چہروں کی اقلیمیں ہیں
(چہروں کی اقلیمیں)

دو متضاد، متصادم لشکروں کے درمیان گھرے ہوئے گوشۂ سکوں کے متلاشی مجید امجد زندگی کے آخری لمحے تک شہرِ مبورخ کی طرح فاصلوں کی کمند سے آزاد تھے اور اسی لئے آزاد تھے کیونکہ وہ لذت یابی سے زیادہ زندگی کے جوہر کے جویا تھے جس کو وہ درد اور کرب احساس سے سہ آتشہ بنانے کے بعد دوام سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔

سبو میں بھر لو، یہ مدھ مدرا کہ اس کی ہر لوند سال بھر دو سو صراحیوں
میں دیے جلاتے
یہی قرینہ ہے زندگی کا، اس طرح سے لپکتے قرنوں کے اس چمن میں

نہ جانے کب سے
ہزار ہا تپتے پیلے سورج لنڈھا رہے ہیں وہ پگھلا تانبا، وہ دھوپ
جس کا مہین آنچل
دلوں سے مَس ہے وہ زہر جس میں دکھوں کا رس ہے
جو ہو سکے تو اس آگ سے بھر لو من کی چھاگل
کبھی کبھی ایک بوند اس کی کسی نوا میں دیا جلاتے
تو وقت کی ہینگ بھول جاتے

———— (صاحب کا فروٹ فارم)

میں نے مجید امجد کے کلام کا تجزیہ نظموں سے مثالیں فراہم کرنے کے باوجود اسالیبِ سخن اور اصنافِ سخن کے پیمانوں سے نہیں کیا۔ کیونکہ بنیادی طور پر مجید امجد رائج الوقت اسالیبِ سخن اور اصنافِ سخن سے ماورا اور آزاد تھے اور نظم اور غزل پر یکساں قدرت رکھنے کے باوجود ایک صنف کی دوسری صنف میں توسیع کرتے رہے۔ نہ ہی میں ان کے اسلوب کے ساتھ رمزیہ اور علامتی جیسے الفاظ منسلک کر کے ان کی انفرادیت کو کوئی مروّج نام دینا چاہتا ہوں، نہ ہی میں شعری آہنگ کا کوئی سنگلاخ نظریہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ مجید امجد اپنی منزل تک پہنچتے پہنچتے وہ سب زنجیریں آہستہ آہستہ توڑ کر پھینک چکے تھے، جنہیں

انہوں نے دورانِ سفر رسمِ زمانہ اور دستور کے احترام میں اختیار کیا تھا۔ اگرچہ عروض، بحر و وزن سے وہ بخوبی واقف تھے اور اپنی مہارت اور چابکدستی کا ثبوت وہ برسوں دیتے رہے تھے۔ اپنی شاعری کے دورِ آخر میں انہوں نے آہنگ کے رسمی پیمانوں سے بھی منہ موڑ لیا۔ اگر وہ چاہتے تو دستورِ زمانہ کے مطابق اپنی نئی مہارت اور آہنگ کے عروضی تنوّع سے قارئین اور سکہ بند ناقدانِ فن کو متاثر کرنے کا سلسلہ جاری رکھ سکتے تھے۔ پھر یہ کیا ہوا کہ وہ صورتِ معنی، معنی صورت کی تلاش کی بجائے معنی کی تلاش میں صرف بحرِ متقارب کے رسیا ہوگئے اور اس کو بھی الفاظ اور ارکان کی ترتیب میں نثر کے قریب لے گئے۔ اسماء کے ذکر میں واحد کی بجائے بار بار صیغہ جمع استعمال کرنے لگے (حریں، تسکینیں، ترتیبیں، نزدیکیاں وغیرہ) اندرونی قافیہ جس کے وہ ہاپکنز (HOPKINS) کی طرح دلدادہ تھے اور جس کا استعمال وہ اکثر کرتے تھے ان کے ہاں آہستہ آہستہ مقابلتاً محدود ہوگیا۔ مرصع کاری اور تزئین کاری ان کے ہاں رفتہ رفتہ ثانوی حیثیت اختیار کرگئی۔ ان کی دورِ آخر کی نظمیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ تسلسل کی تلاش میں مصرعوں، ٹکڑوں، وقفوں مختصر نظموں سے ماوریٰ جا چکے تھے اور مختصر نظموں کی شکل میں بھی زندگی کی طرح ایک مسلسل طویل لامختتم نظم لکھ رہے تھے۔

میں نے اس سوال پر کتنی بار غور کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ چونکہ مجید امجد اپنی ذات کو حرص و ہوس تمام آلائشوں اور آلودگیوں سے پاک کرنا چاہتے تھے۔ ارضی زندگی سے زیادہ جوہر زندگی کے متلاشی تھے۔ اس لئے جوہر زندگی کا ہم معنی شعر انہیں صرف سلاسل سے آزاد ہو کر ہی حاصل ہو سکتا تھا۔

مجید امجد کا سفر وجود کی سیاحت کا زمیہ تھا۔ اس سفر میں وہ اپنے ہی خون میں سرگرمِ سفر رہے۔ خرقہ پوشی، درویشی، وارفتگی ان کے ہاں محض رسمی اسلوب نہیں تھی بلکہ طرزِ احساس طرزِ زندگی تھی۔ اپنی معراجِ فن حاصل کرنے کے لئے انہیں چینی تیر انداز کی طرح ساز و سامان اور رسوم و تکلفات سے بہر حال ماورا جانا تھا۔ کیونکہ نیلگوں آسماں میں جوہرِ حیات کے درخشاں ستارے ان کے ارفع مقام رفقاان کے منتظر تھے۔

شمیم حیات سیال

مجید امجد — دانشوروں کی نظر میں

اردو نظم میں مجید امجد کی شاعری   توازن کی ایک نہایت خوب صورت مثال فراہم کرتی ہے۔ مجید امجد کی نظموں کے مطالعے سے پہلا تاثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ شاعر کے باطن کی دنیا میں خارج کے مظاہر سے منسلک اور ہم آہنگ ہے۔ اور یہ ہم آہنگی اور مفاہمت عافیت یا فرار سے حائل نہیں بلکہ اس شدید جذبے کی پیداوار ہے جو جزو کو کل سے مربوط کرتا ہے اور جس کے دباؤ کے تحت شاعر اپنے انا کی دیواروں کو عبور کر کے زندگی کے دوسرے مظاہر سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔ اور اس ربط باہم کو دریافت کر لیتا ہے جو کائنات میں جاری و ساری ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا

مجید امجد ہمارے دور کے بڑے شاعر بھی ہیں اور اہم بھی۔ بڑے غالب انیسؔ اور اقبال کے معنوں میں اہم یوں کہ ان کے مطالعہ کے بغیر ہمارے شاعرانہ ذوق اور فنی ارتقاء کی تربیت نامکمل رہے گی۔ ان کا مطالعہ ارتقائے ذہنی اور عرفانِ حیات و کائنات کے لئے بے حد ضروری ہے۔ ان کا شاعرانہ اسلوب اور دلیرانہ لب و لہجہ ہمارے دور کے تہذیبی میلانات کی بڑی مکمل اور خوبصورت

تصویر ہے۔ ——— سید جعفر طاہر

مجید امجد تمام عمر شعر کہتا رہا اور زندگی کی مسرتوں کو ترستا رہا۔ مجید امجد کی انفرادیت نے اردو شاعری کو نیا لہجہ اور چونکا دینے والا اسلوب ہی نہیں دیا۔ اس نے عروس شعر کی مانگ سنوارنے کے لئے اپنا جگر صرف کیا ہے۔

——— تاج سعید

مجید امجد کی نہ تو کوئی شخصیت ہے اور نہ کوئی جسم۔ وہ تو فقط خیال ہے۔ روح ہی روح۔ روح جو اک کمزور سے جسم کے پنجر میں مقید ہے اور اپنی آزادی کے لئے ہر وقت کوشاں رہتی ہے۔ جب بھی اڑنے کے لئے پر تولتی ہے تو اک نظم ایک غزل وجود میں آجاتی ہے۔ اور اس سلسلہ میں مجید امجد کی روح کا کرب، تڑپ اور تلملاہٹ سب کچھ نظر آتا ہے۔

——— مقصود زاہدی

"میراجی، فیض اور راشد نے اپنے اپنے مکاتب فکر کو جنم دیا ہے۔ اس عہد کے بیشتر لکھنے والے ان تینوں میں سے کسی نہ کسی کے پیچھے لمبی قطاروں میں کھڑے ہیں۔ مگر مجید امجد کہتا ہے اس نے نہ کسی کی تقلید کی ہے اور نہ کسی کو اپنی تقلید کرنے کی ترغیب دی ہے۔ مجید امجد ابھی تک بہت نیا ہے، جب کہ میراجی فیض اور راشد پرانے ہو چکے ہیں۔

——— شہزاد احمد

مجید امجد کی شاعری اگرچہ کوئی پیغام کوئی فلسفہ اور کوئی آدرش نہیں پیش کرتی لیکن فن کے وہ تمام جمالیاتی اور فنی تقاضے پورے کرتی ہے جو فن کو قیام و دوام بخشنے کے لئے ضروری ہیں۔ مجید امجد گزرتی رتوں، ڈھلتی شاموں اور اداس راتوں کا شاعر ہے۔ وہ بچھڑے دنوں، پرانی برساتوں، ادھوری ملاقاتوں اور تنہا چاندنیوں کا شاعر ہے۔ فرخ درانی

اردو شاعری زیادہ تر شہری بلکہ شہر زدہ رہی ہے، پھر بھی مجید امجد کی شاعری میں جس شہر کا ذکر ہے، وہ نیا نویلا ہے۔ بیسویں صدی کا شہر ہے اور اسے بستے والا متوسط طبقے کا نوجوان بھی نو وارد کی حیثیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن

مجید امجد اپنے عہد میں رہتے ہوتے اپنے عہد سے پنہاں رہے۔ مگر عہد ان سے پنہاں نہیں تھا۔ عہد سے ایک سطح پر یکسر بے تعلقی دوسری سطح پر گہرا تعلق کسی ادبی تحریک یا کسی سیاسی قضیے کے واسطے سے نہیں بلکہ طرز احساس کے واسطے سے انہوں نے عہد سے رشتہ پیدا کیا تھا۔ انتظار حسین

مجید امجد اردو غزل کی بدلتی ہوئی روایت کا ایک اہم زاویہ ہے۔ اس نے غزل کے فنی اور فکری امکانات کا دائرہ وسیع کیا اور اس کی نشاۃ ثانیہ کو

قریب لانے میں معاونت کی۔ اس نے نظم کے جدید مزاج کو غزل میں رائج کرنے کی سعی کی اور اس کوشش میں خارج کی زندگی کے تمام عناصر سے فائدہ اٹھایا۔ جو نظم میں اس کے منفرد تجربے کا جوہر بن چکے تھے۔

انور سدید

مجید امجد کی نظموں کے آخر میں عموماً ایک ایسا اشارہ ہوتا ہے، جسے اخلاقی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ تبلیغی نعرہ لگانے کے بجائے اس بات کو دردمندی سے محض ایک اشارے سے بیان کرتا ہے کہ ایک چوٹ سی بھی لگتی ہے۔ اور زندگی پر ایمان بھی مضبوط ہوتا ہے۔

سہیل احمد

امجد صاحب نہایت کم گو تھے۔ بے تکلف دوستوں میں جن کی تعداد بہت کم تھی وہ تھوڑی بہت بات چیت کر لیا کرتے تھے۔ خصوصاً شعر و ادب کے متعلق مگر ادب کے تمام جدید رجحانات پر نظر رکھتے تھے۔ اور ادبی رسائل میں مشہور شعرا سے لے کر بالکل نئے لکھنے والوں تک کو پڑھتے تھے۔ اور ان کے بارے میں قطعی رائے دیتے تھے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا

آج تک اس بات کا فیصلہ نہیں کر پاتے کہ ان کا دسترخوان ان کے دل سے زیادہ وسیع تھا۔ یا ان کا دل ان کے دسترخوان سے زیادہ وسیع تھا۔ وہ جب

تک ملازمت میں رہے۔ اپنی تنخواہ دوست احباب اور نیازمندوں پر خرچ کرتے
رہے لیکن جب ملازمت سے ریٹائر ہوتے تو اپنی مفلوک الحالی کا کسی سے ذکر
تک نہیں کیا۔ اشرف قدسی

میرے نزدیک مجید امجد کی شاعری کا سب سے خوبصورت سب سے طاقتور
اور سب سے اہم وہ حصہ ہے جس میں اس کے ہاں وطن اور اہل وطن کے
ساتھ کومٹ منٹ" کی نشاندہی ملتی ہے۔ حالانکہ ہمارے دانشوروں کی کھیپ
اس "کومٹ منٹ" کو ادب سے خارج کر دیتی ہے۔ مجید امجد کی انفرادیت اور
عظمت اس امر میں بھی مسلّم ہے کہ اس کی شاعری کا ایک وسیع حصہ وطن اور
اہل وطن سے متعلق ہے۔ گلزار وناچوہدری

مجید امجد جب تک زندہ رہا، اس نے کوشش کی کہ غائب از نگاہ رہے اس
لئے نہیں کہ وہ ہجوم خلائق سے گریزاں تھا یا اسے انسانوں سے پیار نہیں تھا بلکہ
اس کی عزلت گزینی نتیجہ ہی اس پیار کا تھا، جو اسے نسل انسان کے افراد سے
تھی۔ اپنی شعری کاوشوں کے ذریعے وہ انسانی روح کو ابدی مسرتوں کے
سرچشمے سے فیض یاب کرنا چاہتا تھا۔ مرزا ادیب

فلسفیانہ فکری شعور اور اپنے منفرد اسلوب کے سبب وہ عصرِ حاضر میں
نظم کا سب سے بڑا شاعر کہلانے کا مستحق ہے۔ اسرار زیدی

نئی نئی ترکیبوں میں ترنم اور آہنگ بھرنے کا سلیقہ جیسے اسے آتا تھا اس دور کے کسی بھی شاعر کو کم نصیب ہوگا۔ اس نے شاعری کو جدید رجحانات سے آشنا کیا۔ مگر کلاسیکی روایات کو مجروح نہ ہونے دیا۔

اظہر جاوید

مجید امجد ہمارے عہد کا ایک اہم شاعر ہے۔ اسے اس عمر میں جس طور پر نظر انداز کیا گیا ہے، آنے والے دنوں میں ایسا نہیں کیا جاسکے گا۔ مجید امجد ہمیشہ زندہ رہنے والے فن کاروں میں سے ہے۔ ان میں سے جو آنے والے قافلوں کو دور تک راستے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس کا حق مجید امجد کو اس لئے بھی بہت زیادہ ہے کہ اس نے اپنے ہمعصروں میں سب سے طویل شعری مجاہدہ کیا۔ اس نے اپنا فنی سفر اس وقت بھی جاری رکھا جب اس کے ساتھ روانہ ہونے والوں نے کمر کھول دی یا ان کا اندوختہ ختم ہوگیا۔ اور وہ سفر ترک کر بیٹھے۔ مجید امجد ان میں ایک ایسا شاعر ہے جو زندگی کے آخری سانس تک قدم زن رہا۔ اس کے اس طویل سفر کی پر آشوب اور دل کش داستان مسافروں کو جہاں راہ دکھاتے گی۔ وہاں انہیں عزم سفر کا حوصلہ بھی

دے گی۔

ذوالفقار احمد تابش

مجید امجد کی شاعری ایک ایسے صحت مند آدمی کی شاعری ہے۔ جس نے سماج کے بطن کا سرطان انگلیوں میں انڈیلا۔ اور اپنی شاعرانہ جراحت کی صلاحیتوں سے اپنا اور سماج کا آپریشن کرنے کی کوشش کی۔

سعادت سعید

امجد اس دور کا واحد شاعر تھا۔ جسے ہم مسلک و مشرب کے اعتبار سے شاعر انسانیت کہہ سکتے ہیں۔ وہ عمل خیر کا مظہر اور اقبال کے تصور مرد مومن کی اپنی ذات میں تفسیر تھا۔ یہ دَور اپنے اس عظیم فلسفی کے بارے میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر رہا کہ وہ عظیم شاعر تھا یا عظیم انسان۔

بلال زبیری

جنت میں بستی بسانے سے پہلے وہ ایک دن کڑکے جاڑے اور گھنی کہر کو چیر کر مجھے ملنے آتے تھے۔ اس وقت ایک مگجا اور میلا کوٹ مرحوم کے نحیف و نزار بدن کا بھرم رکھے ہوتے تھا۔ اس حال میں دیکھ کر میرے دل میں درد اٹھا وہ چلے گئے تو میں سوچتا رہا۔ امجد کتنا عظیم ہے۔ میں غالب اور اقبال کے بعد اردو دربان کے اس شاعر اور عظیم انسان کو سو سلام نیاز پیش کرتا ہونگا

شیر افضل جعفری

مجید امجد نے مرنے سے پیشتر کوئی پریس کانفرنس نہیں بلوائی تھی۔ اور اس کی ضرورت اس نے زندگی میں بھی محسوس نہیں کی تھی۔ اس کی کائنات تعلقات سے نہیں شاعری سے بنی تھی۔ اس نے کبھی غیر شاعرانہ وسیلوں سے قد اونچا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔
اصغر ندیم سید

اس تنہا شاعر نے خواجہ فرید، بلّھے شاہ اور سلطان باہُو سے فیض پایا ہے۔
مظفر علی سید

مجید امجد تو دھرتی کا دل بھی نہیں دکھاتے تھے۔
جعفر شیرازی

وہ غالب اور اقبال کے بعد اردو کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ آج اردو شاعری کا غرور ڈھل گیا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ شاعری کے ایوان میں اس کے جانے کے بعد ساری کرسیاں خالی پڑی ہیں۔
عبدالرشید

مجید امجد کا کلام نئی شاعری کا منشور ہے۔
عابد عمیق

میں نے بہت کم ایسے شاعر دیکھے ہیں جن کے یہاں زندگی کی ہولناک سنجیدگی اور مقدر کی ستم رسانی کے ایسے دردناک تصورات موجود ہیں۔ اس

کے باوجود اس کے قاری کا مجموعی تاثر مسرت اور انبساط میں اتنا ڈوب کر باہر آتا ہو۔ اور مطمئن ہو جتنا مجید امجد کے کلام سے ہوتا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

مجید امجد کو رفعت مقام بھی حاصل ہے اور شہرتِ دوام بھی۔ البتہ اس رفعت کے ادراک اور اس شہرت کے اعتراف میں دیر ہو رہی ہے۔ اور وجہ صرف یہ ہے کہ وہ معمول کا شاعر نہیں تھا۔ اس کے لہجے کے دھیمے پن میں جو کاٹ ہے، اس سے ہم مانوس نہیں ہیں۔

احمد ندیم قاسمی

مجید امجد کی شاعری دوسرے شاعروں کی طرح غیر مربوط بکھری ہوئی یا آزاد نہیں ہے۔ وہ تو ایک آورش، ایک منشور کے تحت قلم کو کاغذ کا وصل بخشتا رہا۔ اس کی ہر نظم اور غزل کا ہر شعر تسبیح کے رنگ رنگ دانوں کی حیثیت رکھتا ہے جو ایک دھاگے میں پرو دئے گئے ہیں، اور اس پر جو وظیفہ پڑھا جاتا ہے وہ ہے ــــ غم غم غم غم ـــ غم جو ساری دنیا اور دنیا کی ہر شے کا مقدر ہے لیکن جس سے آنکھیں ملانے کا حوصلہ بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔

خاطر غزنوی

مجید امجد کا شعری تجربہ حیرت انگیز حد تک اپنے عہد کے ساتھ ہی نہیں چلتا بلکہ اس سے آگے بڑھتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری

غزلیں

پلٹ پڑا ہوں شعاعوں کے چیتھڑے اوڑھے
نشیبِ زینۂ ایّام پر عصا رکھتا

(۱)

جنونِ عشق کی رسمِ عجیب کیا کہنا　　میں ان سے دور وہ میرے قریب کیا کہنا
یہ تیرگیٔ مسلسل میں ایک وقفۂ نور　　یہ زندگی کا طلسمِ عجیب کیا کہنا

جو تم ہو برقِ نشیمن تو میں نشیمنِ برق
الجھ پڑے ہیں ہمارے نصیب کیا کہنا

ہجومِ رنگِ فراواں سہی، مگر پھر بھی　　بہار۔ نوحۂ صد عندلیب؛ کیا کہنا
ہزار قافلہ زندگی کی تیرہ شبی　　یہ روشنی سی افق کے قریب کیا کہنا

لرز گئی تری لو میرے ڈگمگانے سے
چراغِ گوشۂ کوئے حبیب کیا کہنا

(۲)

کیا رُوپ دوستی کا، کیا رنگ دشمنی کا　　کوئی نہیں جہاں میں کوئی نہیں کسی کا
اِک تنکا آشیانہ، اک راگنی اثاثہ　　اک موسمِ بہاراں، مہمان دو گھڑی کا

آخر کوئی کنارا، اس سیلِ بے کراں کا
آخر کوئی مداوا، اس دردِ زندگی کا

میری سیہ شبی نے اِک عمر آرزو کی — لرزے کبھی افق پر تاگا ستارۂ روشنی کا
شاید ادھر سے گزرے پھر بھی ترا سفینہ — بیٹھا ہوا ہوں ساحل پہ نے بلب کبھی کا

اس التفات پر ہوں لاکھ التفات قرباں
مجھ سے کبھی نہ پھیرا رخ تو نے بے رخی کا

اب میری زندگی میں آنسو ہیں اور نہ آہیں — لیکن یہ ایک میٹھا میٹھا سا روگ جی کا
او مسکراتے تارو، او کھلکھلاتے پھولو — کوئی علاج میری آشفتہ خاطری کا

(۳)

ایک ایک جھروکا خندہ بلب، ایک ایک گلی کہرام
ہم لب سے لگا کر جام ہوتے بدنام بڑے بدنام
رُت بدلی کہ صدیاں لوٹ آئیں، اُف یاد کسی کی یاد
پھر سیلِ زماں میں تیر گیا اک نام، کسی کا نام
دِل ہے کہ اِک اجنبیِ حیراں، تم ہو کہ پرایا دیس
نظروں کی کہانی بن نہ سکیں، ہونٹوں پہ رُکے پیغام
روندیں تو یہ کلیاں، نیشِ بلا! چومیں تو یہ شعلے پھول
یہ غم یہ کسی کی دین بھی ہے، انعام عجب انعام
اے تیرگیوں کی گھومتی رَو، کوئی تو رسیلی صبح
اے روشنیوں کی ڈھلتی لَو، اِک شام، نشیلی شام

رہ رہ کے جیالے راہیوں کو دیتا ہے یہ کون آواز
کونپن کی ہنستی منڈیروں پر، تم ہو کہ غمِ ایام
بے برگ شجر، گردوں کی طرف، پھیلائیں ہمکتے ہات
پھولوں سے بھری ڈھلوان پہ سوکھے پات کریں بسرام
ہم نگر میں ہیں اس عالم کا دستور ہے کیا دستور
یہ کس کو خبر، اس نگر کا ہے دستور دو عالم نام

(۴)

اس اپنی کرن کو آتی ہوئی صبحوں کے حوالے کرنا ہے
کانٹوں سے الجھ کر جینا ہے، پھولوں سے لپٹ کر مرنا ہے
شاید وہ زمانہ لوٹ آئے، شاید وہ پلٹ کر دیکھ بھی لیں
ان اجڑی اجڑی نظروں میں، پھر کوئی فسانہ بھرنا ہے
یہ سوزِ دروں، یہ اشکِ رواں، یہ کاوشِ ہستی کیا کہیے
مرتے ہیں کہ کچھ دن جی لیں ہم، جیتے ہیں کہ آخر مرنا ہے
اک شہرِ وفا کے بند دریچے آنکھیں میچے سوچتے ہیں
کب قافلہ ہائے خندہ گل کو ان راہوں سے گزرنا ہے
اس نیلی دھند میں کتنے بجھتے زمانے راکھ بکھیر گئے
اک پل کی پلک پہ دنیا ہے، کیا جینا ہے، کیا مرنا ہے

رستوں پہ اندھیرے پھیل گئے اِک منزلِ غم تک شام ہوئی
اے ہم سفرو! کیا فیصلہ ہے اب چلنا ہے کہ ٹھہرنا ہے
ہر حال میں اِک شوریدگیٔ افسونِ تمنّا باقی ہے
خوابوں کے بھنور میں بہہ کر بھی خوابوں کے گھاٹ اترنا ہے

(۵)

مہکتے میٹھے، مستانے زمانے — کب آئیں گے وہ من مانے زمانے
جو میرے کنجِ دل میں گونجتے ہیں — نہیں دیکھے وہ دنیا نے زمانے
تیری پلکوں کی جنبش سے جو ٹپکا
اسی اک پل کے افسانے زمانے
تیری سانسوں کی سوغاتیں بہاریں — تیری نظروں کے نذرانے زمانے
کبھی تو میری دنیا سے بھی گزرو — لئے آنکھوں میں اَن جانے زمانے
انہی کی زندگی جو چل پڑے ہیں — تیری موجوں سے ٹکرانے زمانے
میں فکرِ رازِ ہستی کا پرستار
میری تسبیح کے دانے زمانے

(۶)

دل سے ہر گزری بات گزری ہے — کس قیامت کی رات گزری ہے
چاندنی، نیم وا دریچہ، سکوت! — آنکھوں آنکھوں میں رات گزری ہے

ہائے وہ لوگ، خوبصورت لوگ   جن کی دھن میں حیات گزری ہے
کسی بھٹکے ہوئے خیال کی موج
کتنی یادوں کے ساتھ گزری ہے
تمتما ہے چہرۂ ایام   دل پہ کیا واردات گزری ہے
سر کوئی آس لڑکھڑاتی ہے   کہ نسیم حیات گزری ہے
بجھتے جاتے ہیں دکھتی پلکوں پہ دیپ
نیند آئی ہے! رات گزری ہے

(۷)

روش روش پہ ہیں نکہت فشاں گلاب کے پھول
حسین گلاب کے پھول، ارغواں گلاب کے پھول
افق افق پہ زمانوں کی دھند سے ابھرے
طیور، نغمے، ندی، تتلیاں گلاب کے پھول
کس انہماک سے بیٹھی کشید کرتی ہے
عروس گل بہ قبائے جہاں، گلاب کے پھول
جہاں گریۂ شبنم سے کس غرور کے ساتھ
گزر رہے ہیں تبسم کناں گلاب کے پھول
یہ میرا دامن صد چاک، یہ ردائے بہار
یہاں شراب کے چھینٹے، وہاں گلاب کے پھول

کسی کا پھول سا چہرہ اور اس پہ رنگ فروز
گندھے ہوئے بہ خم گیسواں گلاب کے پھول
خیالِ یار ترے سلسلے ، نشوں کی رتیں
جمالِ یار ، تری جھلکیاں ، گلاب کے پھول
مری نگاہ میں دَورِ زماں کی ہر کروٹ
لہو کی لہر ، دلوں کا دھواں ، گلاب کے پھول
سلگتے جاتے ہیں ، چُپ چاپ ہنستے جاتے ہیں
مثالِ چہرۂ پیغمبراں ، گلاب کے پھول
یہ کیا طلسم ہے ، یہ کس کی یاسمیں باہیں
چھڑک گئی ہیں جہاں در جہاں ، گلاب کے پھول
کٹی ہے عمر بہاروں کے سوگ میں امجد
مری لحد پہ کھلیں جاوداں گلاب کے پھول

(۸)

جھونکوں میں رس گھولے دِل   پون چلے اور ڈولے دِل
جیون کی رُت کے سو روپ   نغمے ، پھول ، جھکولے دل
تاروں کی جب جوت جگے
اپنے خزانے کھولے دِل

یادوں کی جب پینگ چڑھے　　بول البیلے بولے دل
کس کی دھن ہے باورے دل　　تیرا کون ہے؟ بھولے دل

(۹)

جو ہو سکے تو میرے دل اب اِک وہ قصّہ بھی
ذرا سنا کہ ہے کچھ ذکر جس میں تیرا بھی
کبھی سفر ہی سفر میں جو عمرِ رفتہ کی سمت
پلٹ کے دیکھا تو اڑتی تھی گردِ فردا بھی
بڑے سلیقے سے دنیا نے میرے دل کو دیتے
وہ گھاؤ جن میں تھا سچائیوں کا چرچا بھی
کسی کی رُوح سے تھا رابطہ اپنے حصّے میں تھی
وہ بے کلی، جو ہے موجِ زماں کا حصہ بھی
یہ آنکھیں، ہنستی وفائیں، یہ پلکیں، جھکتے خلوص
کچھ اس سے بڑھ کے کسی نے کسی کو سمجھا بھی
یہ رسم حاصلِ دنیا ہے، اِک یہ رسمِ سلوک
ہزار اس میں سہی نفرتوں کا ایما بھی
دِلوں کی آنچ سے تھا، برف کی سِلوں پہ کبھی
سیاہ سانسوں میں لتھڑا ہوا پسینہ بھی

مجھے ڈھکی چھپی اَن بوجھی الجھنوں سے ملا
جی تیلی ہوتی اک سانس کا بھروسا بھی
کبھی کبھی اَنہی الھڑ ہواؤں میں امجد
سنا ہے درد کے اِک دیس کا سندیسا بھی

(۱۰)

جا وداں قدروں کی شمعیں بجھ گئیں تو جل اٹھی تقدیرِ دل
اب تو اس مٹی کے ہر ذی روح ذرّے میں بھی ہے تصویرِ دل
اپنے دل کی راکھ چن کر، کاش ان لمحوں کی بہتی آگ میں
میں بھی اک سیّال شعلے کے ورق پر لکھ سکوں تفسیرِ دل
میں نہ سمجھا ورنہ ہنگاموں بھری دنیا میں اک آہٹ کے سنگ
کوئی تو تھا، آج جس کا قہقہہ دل میں ہے دامن گیرِ دل
رت بدلتے ہی چمن جو ہم صفیر اب کے بھی اتنی دور سے
آ کے جب اس شاخ پر چہکے میرے دل میں، بجی زنجیرِ دل
کیا سفر تھا، بے صدا صدیوں کے پل کے اس طرف اس موڑ تک
پے بہ پے ابھرا، سنہری گرد سے، اک نالۂ دلگیرِ دل
وار دنیا نے کئے مجھ پر تو امجد میں نے اس گھمسان میں
کس طرح جی ہار کر رکھ دی نیامِ حرف میں شمشیرِ دل

(۱۱)

بچا کے رکھا ہے جن کو غروبِ جاں کے لئے
یہ ایک صبح تو ہے سیرِ بوستاں کے لئے
چلیں کہیں تو سیہ دل زمانوں میں ہوں گی
فراغتیں بھی اس اک صدقِ رائیگاں کے لئے
لکھے ہیں لوحوں پہ جو مردہ لفظ ان میں جتیں
اس اپنی زیست کے اسرار کے بیاں کے لئے
پکارتی رہی بنسی بھٹک گئے ریوڑ
نئے گیاہ نئے چشمِ رواں کے لئے
سحر کو نکلا ہوں سینہ میں اکیلا کس کے لئے
درخت، ابر، ہوا، بوتے ہمرہاں کے لئے
سوادِ نور سے دیکھیں تو تب سراغ ملے
کہ کس مقام کی ظلمت ہے کس جہاں کے لئے
تو روشنی کے ملیدے میں، رزق کی خاطر
میں روشنائی کے گودے میں آبِ ناں کے لئے
ترس رہے ہیں سدا خشت خشت لمحوں کے دیس
جو میرے دل میں ہے، اس شہرِ بے مکاں کے لئے

یہ نین، جلتی لوؤں جیسی نیکیوں والے
گھنے بہشتوں کا سایہ ہیں ارضِ جاں کے لئے
ضمیرِ خاک میں خفتہ ہے میرا دل امجدؔ
کہ نیند مجھ کو ملی خوابِ رفتگاں کے لئے

(۱۲)

صبحوں کی وادیوں میں گلوں کے پڑاؤ تھے
دور ایک بانسری پہ یہ دھن تھی کب آؤ گے
ایک بات رہ گئی کہ جو دل میں نہ لب پہ تھی
اس اک سخن کے، وقت کے سینے پہ گھاؤ تھے
کھلتی کلی کلی، کسی تاکید سے نہیں
ان سے وہ ربط ہے جو الگ ہے لگاؤ سے
عیب اپنی خوبیوں کے چھنے، اپنے غیب میں
جب کھنکھناتے قہقہوں میں من گھناؤنے
کاغذ کے پانیوں سے جو ابھرے تو دور تک
پتھر کی ایک لہر پہ تختے تھے ناؤ کے
کیا وہ تھی، جو نشیبِ افق سے مری طرف
تیری پلٹ پلٹ کے ندی کے بہاؤ سے

(۱۳)

قاصد مست گامِ موج صبا
کوئی رمزِ خرام ، موجِ صبا
وادیٔ برف کا کوئی سندیس   میرے اشکوں کے نام، موجِ صبا
کوئی موجِ خیال میں بہتی   منزلوں کا پیام ، موجِ صبا
تیرے دامن کی خوشبوؤں میں گم
سو سہانے مقام، موجِ صبا
سو سمٹتی مسافتوں کا طلسم   تیری کروٹ کا نام، موجِ صبا
آئی بت جھڑ کے ساتھ لوٹتے وقت   اک بہاریں پیام ، موجِ صبا
اِک نویدِ نگاہ ، پیکِ حبیب
اِک جوابِ سلام، موجِ صبا

(۱۴)

اب یہ مسافت کیسے طے ہو، اے دل تو ہی بتا
کٹتی عمر اور گھٹتے فاصلے، پھر بھی وہی صحرا
چیت آیا ، چیتاونی بھیجی ، اپنا وچن نبھا
پت جھڑ آئی ، پتر لکھے ، آجیون بیت چلا
خوشیوں کا مکھ چوم کے دیکھا ، دنیا مان بھری
دکھ وہ سجن کٹھور کہ جس کو روح کرے سجدا

اپنا پیکر، اپنا سایہ، کالے کوسں کٹھن
دوری کی جب سنگت ٹوٹی، کوئی قریب تھا
اپنے گرداب اپنے آپ میں گھلتی سوچ بھی
کس کے دوست اور کیسے دشمن سب کو دیکھ لیا
کانچ کی اک دیوار زمانہ، آمنے سامنے ہم
نظروں سے نظروں کا بندھن جسم سے جسم جُدا
راہیں دھڑکیں شاخیں کڑکیں اک اک ٹیس اُٹھی
کتنی تیز چلی ہے اب کے دھول بھری دکھنا
دکھڑے کہتے لاکھوں مکھڑے کس کس کی سنیئے
بولی تو اِک اِک کی دلیسی، بانی سب کی جُدا

(۱۵)

سفر کی موج میں تھے وقت کے غبار میں تھے
وہ لوگ جو ابھی اس قریۂ بہار میں تھے
وہ ایک چہرے پہ بکھرے تھکے تھکے سے خیال
میں سوچتا تو وہ غم میرے اختیار میں تھے
وہ ہونٹ جن میں تھا میٹھی سی ایک پیاس کا رس
میں جانتا تو وہ دریا میرے کنار میں تھے

مجھے خبر بھی نہ تھی اور اتفاق سے کل
میں اس طرف سے جو گزرا وہ انتظار میں تھے
میں کچھ سمجھ نہ سکا میری زندگی کے خواب
ان انکھڑیوں میں جو تیرے تھے کس شمار میں تھے
میں دیکھتا تھا وہ آتے بھی اور چلے بھی گئے
ابھی یہیں تھے ابھی گردِ روزگار میں تھے
میں دیکھتا تھا، اچانک یہ آسمان یہ کُرّے
بس ایک پل کو رکے اور پھر مدار میں تھے
ہزار بھیس میں سیّار موسموں کے سفیر
تمام عمر مری روح کے دیار میں تھے

(۱۶)

اور اب یہ کہتا ہوں، یہ جرم تو روا رکھتا
میں عمر اپنے لئے بھی تو کچھ بچا رکھتا
خیال صبحوں کرن ساحلوں کی اوٹ سدا
میں موتیوں جڑی بنسی کی لَے جگا رکھتا
جب آسماں پہ خداؤں کے لفظ ٹکراتے
میں اپنی سوچ کی بے حرف لَو جلا رکھتا

ہوا کے سایوں میں ہجر اور ہجرتوں کے وہ خواب
میں کاکش دِل میں وہ سب منزلیں سجا رکھتا

ہر حدوں تک ابھرتی یہ لہر جس میں ہوں میں
اگر میں سب یہ سمندر بھی وقت کا رکھتا

پلٹ پڑا ہوں شعاعوں کے چھیڑے اوڑھے
نشیب زینۂ ایام پر عصا رکھتا

یہ کون ہے جو میری زندگی میں آ آ کر
ہے مجھ میں کھوتے میرے جی کو ڈھونڈتا رکھتا

غموں کے سبز تبسم سے کنج لہکے ہیں
سے کے ستم ثمر ہیں، میں اور کیا رکھتا

کسی خیال میں ہوں یا کسی خلا میں ہوں
کہاں ہوں، کوئی جہاں تو مرا پتہ رکھتا

جو شکوہ اب ہے یہی ابتدا میں تھا امجد
کریم تھا میری کوشش میں انتہا رکھتا

(۱۷)

میری مانند، خود نگر تنہا — یہ صراحی میں پھول نرگس کا
اتنی شمعیں تھیں تیری یادوں کی — اپنا سایہ بھی اپنا سایہ نہ تھا

میرے نزدیک تیری دوری تھی
کوئی منزل تھی کوئی عالم تھا
ہاتے وہ زندگی فریب آنکھیں تونے کیا سوچا، میں کیا سمجھا
صبح کی دھوپ ہے کہ دستوں پر منجمد بجلیوں کا اک دریا
گھنگھروؤں کی جھنک جھنک میں بسی
تیری آہٹ! میں کس خیال میں تھا
پھر کہیں دل کے برج پر کوئی عکس فاصلوں کی فصیل سے ابھرا
پھول مرجھا نہ جائیں بجروں میں مانجھیو! کوئی گیت ساحل کا
وقت کی سرحدیں سمٹ جائیں
تیری دوری سے کچھ بعید نہ تھا
عمر جلتی ہے بخت جلووں کے زیست مٹتی ہے بھاگ مٹی کا
راہیں دردوں کی چوکیاں چوکس پھول لوہے کی باڑ پر بھی کھلا
جو خود ان کے دلوں میں تھا تہ سنگ
وہ خزانہ کسی کسی کو ملا
لاکھ قدریں تھیں زندگانی کی یہ محیط، اک عجیب زاویہ تھا
ہے جو یہ سر پہ گیان کی گٹھڑی کھول کر بھی کبھی اسے دیکھا
روز جھکتا ہے کوئے دل کی طرف
کاخِ صد بام کا کوئی زینا

(۱۸)

کیا کہیئے کیا حجابِ حیا کا فسانہ تھا
سب کچھ بس اک نگاہِ کرم کا بہانہ تھا
دیکھا تو ہر تبسم لب والہانہ تھا پرکھا تو ایک حیلہ ضعف گرانہ تھا
دنیا امیدِ دید کی دنیا تھی دیدنی دیوار و در اداس تھے ہر سم سہانا تھا
ہائے وہ ایک شام کہ جب مست نے بہ لب
میں جگنوؤں کے دیس میں تنہا روانہ تھا
یہ کون ادھر سے گزرا، میں سمجھا حضور تھے اک موڑ سا اور مڑ کے جو دیکھا زمانہ تھا
اک چہرہ اس پہ لاکھ سخن تاب رنگتیں اے جرأتِ نگہ تیری قسمت میں کیا نہ تھا
ان آنسوؤں کی رو میں نہ تھی موتیوں کی کھیپ
ناداں سمندروں کی تہوں میں خزانہ تھا
اے غم، انیس دل، یہ تیری دلنوازیاں ہم کو تیری خوشی کے لئے مسکرانا تھا
اک طرفہ کیفیت، نہ توجہ نہ بے رخی میرے جنونِ دید کو یوں آزمانا تھا
ہائے وہ دھڑکنوں سے بھری ساعتیں مجید
میں ان کو دیکھتا تھا، کوئی دیکھتا نہ تھا

(۱۹)

برس گیا بہ خراباتِ آرزو ترا غم قدح قدح تری یادیں، سبو سبو ترا غم

تیرے خیال کے پہلو سے اٹھکے جب دیکھا   مہک رہا تھا زمانے میں چار سو ترا غم
غبارِ رنگ میں رس ڈھونڈتی کرن، تیری دھن
گرفتِ سنگ میں بل کھاتی آبِ جو، ترا غم

ندی پہ چاند کا پرتو، ترا نشانِ قدم   خطِ سحر پہ اندھیروں کا رقص تو، ترا غم
طلوعِ مہر، شگفتِ سحر، سیاہیِ شب   تری طلب، تجھے پانے کی آرزو، ترا غم
نگہہ اٹھی، تو زمانے کے سامنے ترا روپ
پلک جھکی تو مرے دل کے روبرو ترا غم

(۲۰)

جب اِک چراغ راہ گزر کی کرن پڑے   ہونٹوں کی لو لطیف حجابوں سے چھن پڑے
یکسں حسینِ دیار کی ٹھنڈی ہوا چلی   ہر موجۂ خیال پہ صد ہا شکن پڑے
- اک پل بھی کنجِ دل میں نہ ٹھہرا وہ رہ نورد
اب جس کے نقشِ پا ہیں چمن در چمن پڑے

اک جست اس طرف بھی، غزالِ زمانہ رقص   رہ تیری دیکھتے ہیں خطا و ختن پڑے
جب انجمن تموّجِ صد گفتگو میں ہو   میری طرف بھی اک نگہِ کم سخن پڑے
صحرائے زندگی میں جدھر بھی قدم اٹھیں
رستے میں ایک آرزوؤں کا چمن پڑے

اس جلتی دھوپ میں یہ گھنے سایہ دار پیڑ   میں اپنی زندگی انہیں دے دوں جو بن پڑے

امجد طریقِ مے میں ہے یہ احتیاط شرط
اک داغ بھی کہیں نہ سرِ پیرہن پڑے

(۲۱)

بنے یہ زہر ہی وجۂ شفا جو تو چاہے — خرید لوں میں یہ نقلی دوا جو تو چاہے
یہ زرد پنکھڑیاں جن پہ حرف حرف ہوں میں — ہوا تے شام میں مہکیں ذرا جو تو چاہے
تجھے تو علم ہے، کیوں میں نے اس طرح چاہا
جو تو نے یوں نہیں چاہا، تو کیا، جو تو چاہے
سلام ان پہ تہِ تیغ بھی جنہوں نے کہا — جو تیرا حکم، جو تیری رضا، جو تو چاہے
جہاں میں تیری شکم سیر روح ہے آزاد — اب اے اسیرِ کمند ہوا، جو تو چاہے
ذرا شکوہِ دو عالم کے گنبدوں میں لرز
پھر اس کے بعد ترا فیصلہ جو تو چاہے
جب اِک سانس گھسے، ساتھ ایک نوٹ پسے — نظامِ زر کی حسیں آسیا، جو تو چاہے
جو تیرے باغ میں مزدوریاں کریں امجد — کھلیں وہ پھول بھی اِک مرتبہ جو تو چاہے

(۲۲)

ہر وقت فکرِ مرگِ غریبانہ چاہیئے
صحت کا ایک پہلو مریضانہ چاہیئے
دنیا تے بے طریق میں جس سمت بھی چلو — رستے میں اِک سلامِ رفیقانہ چاہیئے

آنکھوں میں امڈے، روح کی نزدیکیوں کے ساتھ   ایسا بھی ایک دور کا یارانہ چاہیئے

کیا پستیوں کی ذلتیں، کیا عظمتوں کے فیض
اپنے لیئے عذاب جداگانہ چاہیئے

اب دردِ شش بھی سانس کی کوشش میں ہے شریک   اب کیا ہو، اب تو نیند کو آجانا چاہیئے

روشن ترائیوں سے اترتی ہوا میں آج   دو چار گام لغزشِ مستانہ چاہیئے

امجد ان اشک بار زمانوں کے واسطے
اِک ساعتِ بہار کا نذرانہ چاہیئے

نظمیں

میں اجنبی — میں بے نشاں
میں پا بہ گِل
نہ رفعتِ مقام ہے نہ شہرتِ دوام ہے
یہ لوحِ دل ، یہ لوحِ دل
نہ اس پہ کوئی نقش ہے نہ اس پہ کوئی نام ہے

حسن

یہ کائنات، مرا اک تبسّم رنگین
بہارِ خلد — مری اک نگاہِ فردوسیں
ہیں جلوہ خیز زمین و زماں مرے دم سے
ہے نور ریز فضا تے جہاں مرے دم سے
گھٹا؟ نہیں۔ یہ مرے گیسوؤں کا پرتو ہے
ہوا؟ نہیں۔ مرے جذبات کی تگ و دو ہے
جمالِ گل؟ نہیں۔ بے وجہ ہنس پڑا ہوں میں
نسیمِ صبح؟ نہیں۔ سانس لے رہا ہوں میں
یہ زندگی تو ہے اک جذبۂ الہانہ مرا
یہ عشق تو ہے اک احساسِ بیخودانہ مرا
ظہورِ کون و مکاں کا سبب، فقط میں ہوں
نظامِ سلسلہ روز و شب، فقط میں ہوں

گلی کا چراغ

تیری جلن ہے میرے سوزِ دل کے کتنی قریب
خدا رکھے تجھے روشن، چراغِ کوئے حبیب
تو جانتا ہے میری زندگی کا افسانہ
تو جانتا ہے میں کس شمع کا ہوں پروانہ
لرز لرز گئی اکثر تری یہ نازک لو
ٹھٹک ٹھٹک کے چلا جب کوئی حزیں رہرو
وہ تیرے سانولے سایوں میں اس کا طوفِ نیاز
وہ دُور، موڑ پہ قدموں کی آخری آواز
صدا خفیف سی دستک سے بلتی جلتی ہوئی
اور اس کے بعد کوئی چٹخنی سی کھلتی ہوئی
ہوا کے نرم جھکولوں میں سرسراہٹ سی
گلی کے کونے پہ باتیں سی، کھلکھلاہٹ سی
کہ اتنے میں نظر آیا طویل سایا کوئی
پھر اک صدا کہ "وہ دیکھو ادھر سے آیا کوئی

کواڑ بند، گلی بے صدا، فضا خاموش
اور ایک درد کا مارا مسافر مدہوش
پلٹ چلا انہی رستوں پہ ڈگمگاتا ہوا
دُکھے دُکھے ہوئے، لہجوں میں گنگناتا ہوا
تو جانتا ہے، کسی کی گلی کے پاک چراغ
چراغِ طور سے بھی بڑھ کے تابناک چراغ
کہ تو نہ ہو تو وہ آوارۂ دیارِ حبیب
پہنچ سکے نہ کبھی اُن کے آستاں کے قریب
جو تو نہ ہو تو یہ راز اک فسانہ بن جاتے
نگاہِ اہلِ جہاں کا نشانہ بن جاتے

خودکشی

ہاں میں نے بھی سنا ہے تمہارے پڑوس میں
کل رات ایک حادثۂ قتل ہو گیا

ہاں میں نے بھی سنا ہے کہ اک جام زہر کا
دو جیونوں کی ننھی سی نوکا ڈبو گیا

کوئی دکھی جوان وطن اپنا چھوڑ کر
اپنی سکھی کے ساتھ اک اور دیس کو گیا

دنیا کے خار زار میں سو ٹھوکروں کے بعد
یوں آخر ان کا قصۂ غم ختم ہو گیا

یوں طے کیا انہوں نے محبت کا مرحلہ
ایک ایک گھونٹ اور جو ہونا تھا ہو گیا

دونوں کی آنکھ میں تھا اک اک اشک منجمد
جو خشک خشک پلکوں کی نوکیں بھگو گیا

کچھ کہنے پائی تھی وہ کہ خاموش ہو گئی
کوئی جواب دینے کو تھا وہ کہ سو گیا

پیمانۂ اجل کا وہ تلخابہ اس طرح
روحوں کے زخموں سینوں کے داغوں کو دھوگیا

اکثر یونہی ہوا ہے کہ الفت کا امتحان
دشواریوں میں موت کی آسان ہوگیا

آؤ نا ہم بھی توڑ دیں اس جامِ زیست کو
سنگِ اجل پہ پھوڑ دیں اس جامِ زیست کو

جینے والے

کیا خبر ہے صبح کے ستارے کو ہے اسے فرصتِ نظر کتنی
پھیلتی خوشبوؤں کو کیا معلوم ہے انہیں مہلتِ سفر کتنی
برق بے تاب کو خبر نہ ہوتی
کہ ہے عمرِ دمِ شرر کتنی
کبھی سوچا نہ پینے والے نے جام میں مے تو ہے مگر کتنی
دیکھ سکتی نہیں مآلِ بہار گرچہ نرگس ہے دیدہ ور کتنی
جانے کیا زندگی کی جاگتی آنکھ
ہو گئی اس کی شب بسر کتنی
شمع خودسوز کو پتہ نہ چلا دُور ہے منزلِ سحر کتنی
مسکراتی کلی کو اس سے غرض کہ ہے عمر اس کی مختصر کتنی
جینے والوں کو کام جینے سے
زندگی کا نظام جینے سے

واماندہ

قافلے کتنے پیش و پس گزرے   میری واماندگی پہ ہنس گزرے
کتنے تارے چمک چمک ڈوبے   کتنے بادل برس برس گزرے
سلسلے ہانپتے زمانوں کے   تیز رفتار، دور رس گزرے
کتنی راتیں تڑپ تڑپ کاٹیں
کس قدر دن ترس ترس گزرے
وہ نہ پھر لوٹے، مدتیں گزریں   انہیں دیکھے ہوئے برس گزرے
اب تو یاد ان کی دل میں آتی ہے   جیسے بجلی بہ نبض خس گزرے
ابدی خامشی کی آندھی میں   جیسے کوئی پر مگس گزرے
دُور سے راہرو کے کانوں میں
جس طرح نالۂ جرس گزرے

طلوعِ فرض

سحر کے وقت دفتر کو رواں ہوں
رواں ہوں، ہمرہِ صد کارواں ہوں

بر بازار انسانوں کا انبوہ
کسی دستِ گُل اندوزِ حنا میں   زمانے کی حسیں رتھ کی لگامیں
کسی کف پر خراشِ خارِ محنت
عدم کے راستے پر آنکھ میچے   کوئی آگے رواں ہے کوئی پیچھے

سڑک کے موڑ پر نالی میں پانی
تڑپتا، تلملاتا جا رہا ہے   زدِ جاروب کھاتا جا رہا ہے
وہی مجبوریِ افتادِ مقصد
جو اس کی کاہشِ رفتار میں ہے   مرے ہر گامِ ناہموار میں ہے

کوئی خاموش پنچھی اپنے دل میں
امیدوں کے سنہرے جال بن کے اڑا جاتا ہے چگنے دانے دنکے
فضا تے زندگی کی آندھیوں سے
ہے ہر اک کو بہ چشم تر گزرنا مجھے "چل" کر اسے "اڑ" کر گزرنا

وہ اک اندھی بھکارن لڑکھڑاتی
کہ چوراہے کے کھمبے کو پکڑ لے صدا سے راہگیروں کو جکڑ لے
یہ پھیلا پھیلا، میلا میلا دامن
یہ کاسہ، یہ گلو تے شور انگیز میرا فقر، میری سیلیں، میرا میزا

ابھی کم سن ہے اس کو کیا پڑی ہے
جسے جزداں بھی اک بار گراں ہے وہ بچہ بھی سوئے مکتب رواں ہے
شریک کاروانِ زندگانی
یہ کیا ہے مالک زندانِ تقدیر جوان و پیر کے پاؤں میں زنجیر

شب رفتہ کی یادوں کو بھلانے
دکان پر پان کھانے آگئی ہے جہاں کا منہ چڑانے آگئی ہے

سہے اس میں، مجھ میں، کتنا فرق لیکن
وہی اک فکر اس کو بھی، مجھے بھی کہ آنے والی شب کیسے کٹے گی؟

چمکتی کار فراٹے سے گزری
غبارِ رہ نے کروٹ بدلی، جاگا اٹھا، اک دو قدم تک ساتھ بھاگا
پیاپے ٹھوکروں کا یہ تسلسل
یہی پرواز بھی، افتادگی بھی متاعِ زیست اس کی بھی، مری بھی

گلستاں میں کہیں بھونرے نے چوسا گلوں کا رس، شرابوں سا نشیلا
کہیں پر گھونٹ اک کڑوا کسیلا کسی سڑتے ہوتے جوہڑ کے اندر
پڑا اک رینگتے کیڑے کو بیٹھا مگر مقصد وہی دو سانس جینا
وہ نکلا پھوٹ کر نورِ سحر سے
نظامِ زیست کا دریائے خوں ناب پسینوں، آنسوؤں کا ایک سیلاب
کہ جس کی رَو میں بہتا جا رہا ہے
گدا اگر کا کدو بھی، جامِ جم بھی کلہاڑی بھی، درانتی بھی، قلم بھی

سحر کے وقت دفتر کو رواں ہوں
رواں ہوں ہمرہِ صد کارواں ہوں

پنواڑی

بوڑھا پنواڑی، اس کے بالوں میں مانگ ہے نیاری
آنکھوں میں جیون کی بجھتی اگنی کی چنگاری
نام کی اک ہٹی کے اندر، بوسیدہ الماری
آگے پیتل کے تختے پر، اس کی دنیا ساری
پان، کتھا، سگرٹ، تمباکو، چونا، لونگ، سپاری

عمر اس بوڑھے پنواڑی کی پان لگاتے گزری
چونا گھولتے، چھالیا کاٹتے، کتھ پگھلاتے گزری
سگرٹ کی خالی ڈبیوں کے محل سجاتے گزری
کتنے شرابی مشتریوں سے نین ملاتے گزری
چند کسیلے پتوں کی گتھی سلجھاتے گزری

کون اس گتھی کو سلجھاتے، دنیا ایک پہیلی
دو دن ایک پھٹی چادر میں دکھ کی آندھی جھیلی

دو کڑوی سانسیں لیں، دو چلموں کی راکھ انڈیلی
اور پھر اس کے بعد نہ پوچھو، کھیل جو ہونی کھیلی
پنواڑی کی ارتھی اٹھی ___ بابا اللہ بیلی ___!

صبح بھجن کی تان منو ہر جھنن جھنن لہراتے
ایک چتا کی راکھ ہوا کے جھونکوں میں کھو جاتے
شام کو اس کا کم سن بالا بیٹھا پان لگاتے
جھن جھن، ٹھن ٹھن، چونے والی کٹوری بجتی جاتے
ایک پتنگا دیپک پر جل جاتے، دوسرا آتے

امروز

ابد کے سمندر کی اک موج جس پر مری زندگی کا کنول تیرتا ہے
کسی اَن سنی، دائمی راگنی کی کوئی تان — آزردہ، آوارہ، برباد
جو دم بھر کو آ کر، مری الجھی الجھی سی سانسوں کے سنگیت میں ڈھل گئی ہے
زمانے کی پھیلی ہوئی بیکراں وسعتوں میں یہ دو چار لمحوں کی میعاد...
طلوع و غروب مہ و مہر کے جاودانی تسلسل کی دو چار کڑیاں
یہ کچھ تھرتھراتے اجالوں کا رومان، یہ کچھ سنسناتے اندھیروں کا قصّہ
یہ جو کچھ کہ میرے زمانے میں ہے اور یہ جو کچھ کہ اس کے زمانے میں مَیں ہوں
یہی میرا حصّہ — ازل سے ابد کے خزانوں سے ہے بس یہی میرا حصّہ

مجھے کیا خبر — وقت کے دیوتا کی حسیں رتھ کے پہیوں تلے پس چکے ہیں
مقدّر کے کتنے کھلونے، زمانوں کے ہنگامے، صدیوں کے صد ہا ہیولے
مجھے کیا تعلق — مری آخری سانس کے بعد بھی، دوشِ گیتی پہ مچلے
مہ و سال کے لازوال آبشارِ رواں کا وہ آنچل جو تاروں کو چھو لے
مگر آہ یہ لمحۂ مختصر جو مری زندگی، میرا زادِ سفر ہے

میرے ساتھ ہے، میرے بس میں ہے، میری ہتھیلی پہ ہے یہ لبالب پیالہ!
یہی کچھ ہے لے دے کے، میرے لئے اس خراجاتِ شام و سحر میں، یہی کچھ
یہ اک مہلتِ کاوشِ دردِ ہستی، یہ اک فرصتِ کوششِ آہ و نالہ

یہ صہباتے امروز، جو صبح کی شاہزادی کی مست انکھڑیوں سے ٹپک کر
یہ دورِ حیات آگئی ہے، یہ ننھی سی چڑیاں جو چھت میں چہکنے لگی ہیں
ہوا کا یہ جھونکا، جو میرے دریچے میں تلسی کی ٹہنی کو لرزا گیا ہے
پڑوسن کے آنگن میں پانی کے نلکے پہ یہ چوڑیاں جو چھنکنے لگی ہیں
یہ دنیاتے امروز، میری ہے، میرے دلِ زار کی دھڑکنوں کی امیں ہے
یہ اشکوں سے شاداب دو چار صبحیں، یہ آہوں سے معمور دو چار شامیں
انہی چلمنوں سے مجھے دیکھنا ہے وہ جو کچھ کہ نظروں کی زد میں نہیں ہے

ایک کوہستانی سفر کے دوران میں

تنگ پگڈنڈی، سرِ کہسار بل کھاتی ہوئی
نیچے دونوں سمت گہرے غار منہ کھولے ہوتے
آگے ڈھلوان کے پار اک تیز موڑ۔ اور اس جگہ
اک فرشتے کی طرح نورانی پَر تولے ہوتے
جھک پڑا ہے آکے رستے پر کوئی نخلِ بلند
تھام کر جس کو گزر جاتے ہیں آسانی کے ساتھ
موڑ پر سے ڈگمگاتے رہروؤں کے قافلے ۔
ایک بوسیدہ خمیدہ پیڑ کا کمزور ہاتھ
سینکڑوں گرتے ہوؤں کی دستگیری کا امیں

آہ ۔ ان گردن فرازانِ جہاں کی زندگی
اک جھکی ٹہنی کا منصب بھی جنہیں حاصل نہیں

آٹوگراف

کھلاڑیوں کے خود نوشت دستخط کے واسطے
کتابچے لئے ہوتے
کھڑی ہیں منتظر حسین لڑکیاں
ڈھلکتے آنچلوں سے بے خبر حسین لڑکیاں

مہیب پھاٹکوں کے ڈولتے کواڑ چیخ اٹھے
ابل پڑے ابھرتے بازوؤں، چٹختی پسلیوں کے پر ہراس قافلے
گرے، بڑھے، مڑے بھنور ہجوم کے

کھڑی ہیں یہ بھی راستے پہ اک طرف
بیاضِ آرزو بہ کف
نظر نظر میں نارسا پرستشوں کی داستاں
لرز رہا ہے دم بہ دم
کمان ابرواں کا خم

کسی عظیم شخصیت کی تمکنت

حنائی انگلیوں میں کانپتے ورق پہ جھک گئی
تو زرنگار پلوؤں سے جھانکتی کلائیوں کی تیز نبض رک گئی

کوئی جب ایک نازِ بے نیاز سے
کتابچوں پہ کھینچتا چلا گیا
حروفِ کج تراش کی لکیر سی
تو تھم گئیں لبوں پہ مسکراہٹیں شریر سی

وہ بادلِ ایک مہوشوں کے جگمگھٹوں میں گھرگیا
وہ صفحۂ بیاض پر
بصد غرور کلکِ گوہریں پھری
حسین کھلکھلاہٹوں کے درمیان ـــ وکٹ گری

میں اجنبی ـــ میں بے نشاں
میں پابہ گل
نہ رفعتِ مقام ہے نہ شہرتِ دوام ہے
یہ لوحِ دل، یہ لوحِ دل
نہ اس پہ کوئی نقش ہے نہ اس پہ کوئی نام ہے

افسانے

پھر کلی بن کے کوئی ناچتی آہٹ نہ کھلی
پھر کوئی بنسی نہ بجی
ریگزاروں کے تپکتے سے چمکتے سے نشیب
منزلِ لیلیٰ کے فریب
قصرِ پرویز کی دہلیز پہ روندی ہوئی بیل
دِل کسی فرہاد کا دِل
اک بھنور، ایک گھڑا، ایک خیال محبوب
سو دکھی روحوں کا غروب
برف انبار دیاروں کے کسی پھول کا دھیان
پَر جلی تتلی کی اڑان
ہاں یہ سب جھلسی روایات میں اگنی بھرے خواب
دشتِ حقیقت کے سراب
ہاں یہ سب کچھ فقط آرائشِ افسانہ سہی
صورتِ دنیا نہ سہی
پھر بھی سچ پوچھو تو یہ آندھیاں جلتی بھی رہیں
مشعلیں جلتی بھی رہیں
کاش میں بھی تیرے سوچوں بھرے نینوں میں جلوں
ایک فسانے میں ڈھلوں

متروکہ مکان

یہ محلے یہ گھروندے یہ جھروکے یہ مکان
ہم سے پہلے بھی یہاں
بس رہے تھے سکھ بھرے آنگن۔ سنہری بستیاں
جانے والے گھر کی چاہت سے تہی پہلو نہ تھے
اتنے بے قابو نہ تھے
روکتا کون۔ اس جھکی محراب کے بازو نہ تھے
اک اٹل ہونی کی زنجیروں میں جکڑے قافلے
ساتھ لے جاتے اسے
بات صرف اتنی کہ اس دیوار کے پاؤں نہ تھے
اب وہ روحیں گونجتے جھکڑ میں گھلتی سسکیاں
ان کے مسکن یہ مکاں
منہدم ادوار کے ملبے یہ جلتی ارتھیاں ـــــ
راکھ ہوتی ہڈیوں کے گرم گارے میں گندھی
گرتے اشکوں میں ڈھلی

اب یہی اینٹیں ۔ ہماری عظمتِ افتادگی
پڑ گئے اینٹوں کے مڑتے زاویوں کے بس میں ہم
بھول کے سب اپنے غم، اس دامِ خشت و خس میں ہم
بھڑ گئے آپس میں ہم
یہ محلّے یہ منڈیریں، یہ محل، یہ منڈلیاں
کون دیکھے ـــــ اب یہاں
کھنچ گئی ہیں کتنی دیواریں دلوں کے درمیاں
بھر لئے ہم نے ان ایوانوں میں تھے جتنے شگاف
کون دیکھے آسماں کی چھت میں ہیں کتنے شگاف

ہوٹل میں

بادل گرجا گرے سنہری پردے دلوں، دریچوں پر
بند ہوتے دو گول پپوٹے چونچ میں دب گئی گرم زبان
چھری چلی حلقوم پہ، تڑپا تپتے توے پر تڑختا ماس
سج گئے میز پہ مَے کے پیالے، بٹ گیا طشتوں میں پکوان
چھت پر بارش، نیچے اجلے کالر، گدلی انتڑیاں
ہنستے مکھ، ڈکراتی قدریں، بھوکی مایا کے سب مان
باہر ٹھنڈی رات کا گہرا کیچڑ۔ درد بھرے آورش
چلو یہاں سے۔ ہمیں پکارے ننگی سوچوں کا رتھ بان

ایکٹریس کا کنٹریکٹ

میرا وجود میری زندگی کا بھید ہے دیکھ
یہ ایک ہونٹ کے شعلے یہ برگِ گل سے خراش
یہ ایک جسم کے کندن میں گدگدی سے گداز
یہ ایک روح بھینچے بازوؤں میں کھیلتی لہر
ذرا قریب تو آ — دیکھ تیرے سامنے ہیں
یہ سرخ رس بھرے لب جن کی اک جھلک کے لئے
کبھی قبیلوں کے دل جوشنوں میں دھڑکے تھے
جو تو کہے تو یہی ہونٹ سرخ رس بھرے ہونٹ
ترے لہو میں شگوفے کھلا بھی سکتے ہیں
قریب آ، یہ بدن، میری زندگی کا طلسم
تری نگاہ کی چنگاریوں کا پیاسا ہے
جو تو کہے تو یہی نرم لہریا آنچل
یہی نقاب میری پلکوں میں اٹکی ہوئی
یہی ادا، میری انگڑائیوں... سے مسکی ہوئی

یہ آبشار، ڈھلانوں سے گر بھی سکتی ہے
بس ایک شرط ۔ یہ گوہر سطور دستاویز
ذرا کوئی یہ وثیقہ رقم کرے تو سہی
اکائیوں کے ادھر جتنے دائرے ہوں گے !
ادھر بھی، اتنے ہی عکس ان برہنہ شعلوں کے !

ننھے بچّو

ننھے بچو، مجھ کو اب تک یاد ہے جب میں تمہاری عمر میں تھا
تب وہ لوگ جو مجھ سے بڑے تھے کتنے اچھے لوگ تھے
سچے اور بھلے !
ننھے بچو کل جب تم اس عمر میں ہوگے ، میں جس عمر میں ہوں
تب وہ لوگ جو تم سے بڑے تھے
کبھی کے مٹی اوڑھ کے سارے سو بھی چکے ہوں گے
جانے تم اس وقت ہمارے بارے میں کیا سوچو گے
شاید وہ دن بڑے کٹھن ہوں پھر بھی اتنا کچھ تو یاد رکھو گے نا
کیسے لوگ تھے خود تو اپنے لہو میں ڈوب گئے
لیکن اس مٹی پر آنچ نہ آنے دی
جس پر آج تمہاری آرزوؤں کے باغ مہکتے ہیں ۔

حضرت زینب

وہ قتل گاہ، وہ لاشے، وہ بے کسوں کے خیام
وہ شب، وہ سینۂ کونین میں غموں کے خیام
وہ رات جب تری آنکھوں کے سامنے لرزے
مرے ہوؤں کی صفوں میں ڈرے ہوؤں کے خیام
یہ کون جان سکے تیرے دل پہ کیا گزری
لٹے جب آگ کی آندھی میں غم زدوں کے خیام
ستم کی رات کی کالی قنات کے پیچھے
بڑے ہی خیمۂ دل میں تھے عشرتوں کے خیام
تری ہی برق صدا کی کڑک سے کانپ گئے
یہ زیر چتر مطلّا شہنشوں کے خیام
جہاں پہ سایہ کناں ہے ترے شرف کی ردا
اکھڑ چکے ہیں ترے خیمہ افگنوں کے خیام

گھور گھٹاؤں کے نیچے

گھور گھٹاؤں کے نیچے
پیڑوں کی لچکیلی باہیں
کونپلوں کے کنگن پہنے
جھک جھک کر
جھیل کے پانی پر سے چننے آتی ہیں
پیلے پیلے پتے اور بھورے بھورے بادل
جھیل کی جانب جھکی جھکی
رستے ہی میں جم گئیں شاخوں کی باہیں
جھیل سے کون اٹھا کر دے ان کو
پیلے پیلے پتے اور بھورے بھورے بادل
چاروں اور سے
اُمڈی اُمڈی، گہری چھاؤں، سہانی ہریاول
تھم گئی، آ کر زنگ آلود سلاخوں والی اس کھڑکی کے پاس
جانے جھریوں والا کالا چہرہ لے کر دل کا کب اس ٹھنڈک کو محسوس کرے

ایئرپورٹ تے

میدان ہوائی جہازاں دے اساں وِچ قطاراں ڈِٹھی
سو سو ہتی بلدی کائی رتی تے کائی چِٹّی
اُڈدے آون تے اُڈدے جاون کونجاں وانگ کھٹولے
جنہاں ڈِٹھی ست اسماناں دی ہر گھُجّل تھاں ان ڈِٹھی
لکھاں رنگ برنگے بھیساں وِچ پَے پھردے ہسدے ٹولے
جنہاں ہسدیاں ہسدیاں تروڑ لتی ساڈے دِل دی کھرڈی سِٹّی
تیری راہ وِچ بندھ پہاڑاں دے تیرے کھیاں ہیٹھ سمندر
اُڈ دیئے کونجے لے چل ساڈی دردفراق دی چِٹّھی
جا آکھیں دوردے دیساں دے وسیکاں نوں جا آکھیں
تُسیں بدلاں دے وِچ وسدے اسیں مٹی دے وِچ مٹی

کندن

پیسے اندر جو کندن ہے اس کا لشکارا تو سدا ہماری آنکھوں میں جیتا ہے
سدا ہمارے ذہن میں اِک چمکیلی راحت کے لالچ کو اکساتا ہے
لوگ جب اپنے مطلبوں کی خاطر یوں عجز کی باتیں کر کے ہم کو عاجز کر دیتے ہیں
تو ایسے میں ہمارے اندر جو کندن ہے ہماری آنکھوں میں آکر
ایک لجاجت بھری ہنسی ہنستا ہے
اسی ہنسی کے پیچھے تحفظ کا اک اَن دیکھا پنجہ بھی جھپٹتا ہے اور
نظر نہ آنے والا ایک تصرف کا جبڑا بھی غراتا ہے
یہ سنگین وملائم، رمزِ مروت کی سارے مفہوم ادا کر دیتی ہے۔ اور
اس کے پردے میں گہرے بھیدوں کے اندر، زندگیوں کی حفاظت
کرنے والی خود غرضی جیتی ہے
اس سچے لشکارے والے کھوٹے کندن کی ضو
سدا ہماری آنکھوں میں جیتی ہے
اور۔ اس پر ہم کتنے خوش ہیں

میرے سفر میں

میرے سفر میں اک اک دن کا سورج، اِک اِک دیس تھا
ان دیسوں کے اِک اِک باسی کے دِل سے گزرا ہوں
میں نے دیکھا ان کے دلوں کے آنگن سونے کے تھے
ان کی مگن آنکھوں میں ڈورے سونے کے تھے
اک اک صبح کو ان کی سواری کے لئے آتی تھی، سورج کی رتھ سونے کی
لیکن آج یہ جس پر میری نظر رکی ہے، کون ہے یہ مٹی کا پتلا، ان سڑکوں پر
جس کو دیکھ کے میرے جی میں بھر گئے ہیں وہ آنسو
آنسو، جن کے سبب سے سونے کے وہ سب زنگار جو میرے عقیدوں پر
تھے، اتر گئے ہیں۔
اور اب یہاں کھڑا ہے، میرے سامنے ننگے پاؤں وہ مٹی کا پتلا کیچڑ میں
کرنوں کے کیچڑ میں
اک وہ جس سے اُس کے دیس کے سارے سورج ہم نے چھین لئے ہیں
اور میری نظروں کے سامنے اپنے کرموں کے کیچڑ میں لتھڑی ہوتی
نظر آتی ہیں۔

ساری ملتیں جواب تک ان دنوں کے دلیسوں میں آتی ہیں
میرے سینے کے اندر اک چھوٹا سا کوٹھا گر پڑتا ہے اور
اک چھوٹے سے خیال کی دنیا ان میری آنکھوں میں امڈ آتی ہے
اور میرا دل مجھ سے پوچھتا ہے جانے ہم اپنی روحوں میں کب اس
سورج کو ابھرا ہوا دیکھیں گے
٥ سورج جواب تک کبھی نہیں ڈوبا

کالے بادل

کالے بادل۔ تیرے خوف میں ڈوب کے میرے دریا رُک جاتے ہیں
تیری رو کے ساتھ اُمڈتے اندیشوں کی بابت سوچوں یا ان چڑھتے پانیوں
کو دیکھوں۔
جن پر میری ناؤ رواں ہے، ایسے ساحلوں کی جانب جو
میری آنکھوں میں بسنے والے چہروں کی اقلیمیں ہیں
تیری پرچھائیں سے ڈرنے میں اپنی حقیقت بھی مجھ کو پرچھائیں نظر آتی ہے
مجھ اک ساتے کے یہ خدشے اور تجھ ایک حقیقت کی یہ بیتیں
ایسے ضابطے کی ترتیبیں ہیں جس سے ان دنیاؤں کی نمو ہے
کالے بادل میرے ڈر کو جانچ اور اپنے دخانوں ہی میں بکھر کے گزر جا
ان دریاؤں سے اپنے سایوں کا بوجھ ہٹا لے
ان دریاؤں کو بہنے دے جن پر میرے خیالوں کے یہ دھارے لہراتے ہیں
دھوپ ان پانیوں پر کھیلے گی تو وہ جزیرے چمکیں گے
جو میری آنکھوں میں بسنے والے چہروں کی اقلیمیں ہیں

کچھ دن پہلے

کچھ دن پہلے کی بارش کے بعد۔ اب گیلی فضائیں سوکھ کے تڑخنے لگی ہیں
دھول کے ہلکے ہلکے آسماں جھکے ہوتے ہیں پانیوں پر جو
بھرے ہوتے ہیں دھان کی اک کیاری میں، پکی سڑک کے ساتھ ساتھ
سورج گرد کے پیچھے چھپا ہوا ہے
کیسا دن ہے
صرف اک ٹھنڈے سے جھونکے کی کمی ہے جس کا گزران آسمانوں میں ہے
نہ خیالوں میں ہے
پکی سڑک پر صد ہا پہیے گردش میں ہیں کالے دِلوں کی سمت، آگ لگی
آوازوں کے ساتھ ـــ اور
اک میں سوچتا ہوں، ہر شے پر، گرد کی تہ کیوں ہے، موت پر بھی اور
زندگی پر بھی۔
دل کہتا ہے
شاید مینہ پھر بھی برسے گا

نہ کوئی سلطنتِ غم ہے
نہ اقلیمِ طرب

کیا کہوں، کتنے غموں ـــــ کتنے غموں کی شکن آلود بساط!
وقت کے گھومتے زینوں پہ میرے رکتے ہوتے قدموں کے سات
کس طرح بچھتی لپٹتی ہی چلی آتی ہے
کیا بتاؤں، یہ کہانی بڑی طولانی ہے

یہ میرا قصۂ غم کون سنے؟ کس کو سناؤں؟ کس کو
اپنے احساس کا وہ جلتا ہوا زہر پلاؤں، جس کو
پیتے پیتے میری اک عمر کٹی ہے اک عمر!

دیکھتے ہو ـــــ وہ جو اک جادۂ نورانی ہے
وہ جو اک موڑ ہے اور وہ جو جھروکا ہے سرِ بام بلند
کبھی پہنچی نہیں جس تک سحر و شام کے سایوں کی کمند

وہ جو جھکتی ہوئی مڑتی ہوئی دیواریں ہیں
جن کا منصب انہی گلیوں کی نگہبانی ہے
وہ جو ہر شام انہی گلیوں میں کوئی مست سی لے
بند ہوتے ہوتے دروازوں کے آہنگ میں گھل جاتی ہے
وہ خموشی، سفرِ شب کے تسلسل کی نقیب
جس کی میت پہ اندھیروں نے ردا تانی ہے
میں نے اک عمر، اسی معمورۂ ظلمات میں رقصاں جولاں
ہر قدم اپنے ہی قدموں کی صداؤں سے گریزاں لرزاں
جگرِ جام سے چھینے ہوئے نشوں میں مگن
خاک ان راہوں کی یوں خاک بہ سر چھانی ہے
جس طرح ایک سہارے کی تمنا میں کسی ٹوٹتے تارے کی حیات
مہ و انجم کے سفینوں کی طرف اپنے بڑھاتے ہوتے ہاتھ
خمِ افلاک سے ٹکرا کے بھسم ہو جاتے
(ان خلاؤں میں کسے تاب پرافشانی ہے)
میں بھی پلکوں پہ امنگوں کے دیئے لے کے گرجتے ہوئے طوفانوں میں
منتظر تھا کہ اچانک کہیں باغوں میں، بیابانوں میں!
آ کے بس جاتے کسی نغمۂ شیریں کی بہار

یہ میرے گرد جو پھیلی ہوئی ویرانی ہے
کب یہاں ریزۂ صد ساغرِ بشکستہ سے کلیاں پھوٹیں

میں نہیں کہتا، کہ کلیاں نہیں مہکیں میرے گلزاروں میں
مجھ کو غم ہے وہ اک لمحہ نایاب کہ جو
حاصلِ سلطنتِ عالمِ امکانی ہے
جب میری زلیست سے ٹکرا کے بھسم ہو بھی گیا تب مجھے معلوم ہوا
تب میں سمجھا کہ یہ راہیں، یہ گھروندے، یہ بھٹکتی دنیا
اب یہ سب کچھ، غمِ جاوید کی اک دھڑکن ہے
اب یہی زخم ہیں اور شغلِ نمک سی دانی ہے

آج بھی جب کہیں رستے میں، کسی موڑ، کسی منزل پر
کسی دیوار سے کنکر بھی پھسل جاتا ہے
کوئی دامن، کہ جسے نازِ گل افشانی ہے
دھوپ میں سوکھتی خرما کی چنگیروں سے بھرے کوٹھوں سے
ایک پل کے لئے اڑتا ہے اسمٹتا ہے تو دھیرے دھیرے
کوئی نے سی میرے احساس میں بھر جاتی ہے

تارِ بربط کی کوئی لرزش پنہانی ہے
جو شب و روز کے ایوان میں فغاں بن کے بکھر جاتی ہے
آسمانوں سے، زمینوں سے، کسی دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
کوئی چپکے سے میرے کان میں کہہ جاتا ہے
سنتے ہو؟ کس کی یہ آواز ہے؟ پہچانی ہے

یوں کب تک صبح و شام جلیں   بے سود جلیں، ناکام جلیں
یہ سب زنجیریں توڑ بھی دیں   اب اس بستی کو چھوڑ بھی دیں
جب دنیا والے سو جائیں
میٹھے سپنوں میں کھو جائیں
جب چلتے دریا تھم جائیں   تاروں کی نگاہیں جم جائیں
جب آگ بجھے چوپالوں کی   جب آنکھ لگے رکھوالوں کی
دیوار و در سے چھپتے ہوتے
سائے کی طرح سمٹتے ہوتے
دو بھک منگوں کے بھیس میں ہم   جا نکلیں اک اور دیس میں ہم
کچھ دور افق کے پار ادھر   ہے ایک نیا سنسار ادھر
خوشیوں کی، سنگاروں کی دنیا
پھولوں کی بہاروں کی دنیا

آج اس فرصتِ یک گام کو روتا ہوں جب ایک لغزشِ پا
چھین کر لے گئی مجھ سے وہ امنگوں کی جھلکتی دنیا
آہ وہ دنیا، جسے کھو کے میں پھر پا نہ سکا
یوں تو آفاق میں دنیاؤں کی ارزانی ہے
ان خلاؤں میں ستارے بھی ہیں، خورشید بھی ہے، ماہ بھی ہے
کون جانے کہ زمانے کے سمندر کی کوئی تھاہ بھی ہے
لیکن اک دنیا، جسے کھو کے میں پھر پا نہ سکا
جس کے ماتم میں مری چاک گریبانی ہے
میری سم خوردہ تمناؤں کی نظروں سے گریزاں ہی رہی
لاکھ ڈھونڈا، مگر افسوس، بس اک رنج پشیماں نکلی
بوجھ بن کے میری تقدیر کی پلکوں پہ رہا
اب مرا دل ہے کہ اک عالمِ حیرانی ہے
اب یہ دنیا، یہ صدا کوش نصیبوں سے بھرے شہر و دیار
غموں خوشیوں کے جھمیلوں میں نہاتی ہوئی روحوں کا نکھار
مجھ سے پوچھو تو مرے سامنے اب یہ دنیا
"ورقِ مصحفِ اندوہ گراں جانی ہے"

سوچتا ہوں یہی دو گھونٹ جو میں نے خمِ دوراں سے پیے
یہی دو سانس شبستانِ ابد میں یہی دو بجھتے دیئے
دوشِ وفردا کی فصیلوں میں یہی دو رخنے
یہی جو سلسلۂ زندگیِ فانی ہے!
کیا اسی ساعتِ محرومیِ غم تاب کی خاطر میں نے
وسعتِ وادیِ ایّام میں کانٹوں کے قدم چومے تھے
لاکھوں دنیاؤں کے لٹتے ہوتے کھلیانوں سے
میرا حصّہ یہی میری تہی دامانی ہے؟
کہ جب اس سطحِ خروشندہ پہ ڈھونڈوں میں کوئی رخشِ طرب
کوئی مکھ، کوئی نگاہ، کوئی تبسم، کوئی جینے کا سبب
آسمانوں سے صدا آتے تو کیا ڈھونڈتا ہے؟
تیرا ساماں، تو یہی بے سروسامانی ہے!؟"

عقل حیران ہے، یہ طرفہ حجاباتِ حرمِ اسرار!
عقدہ راحت و غم، رازِ جہانِ گل و خار
پابہ زنجیر ارادوں کا خروشِ پیہم!
یہی مستقبلِ معمورۂ انسانی ہے؟

کس کی فتراک میں ہیں عرش بریں فرش زمیں ؟ کون کہے
بس صد پردۂ افلاک کوئی ہے کہ نہیں ؟ کون کہے
جانے کن گہرے دھندلکوں سے ضیا پاتی ہے
درحقیقت یہ حقیقت کی جو تابانی ہے ،
اتنے زخموں سے سجا کر دلِ بے تاب کی پژمردہ جبیں
کس نے بھیجا ہمیں اس جلتے ہوتے دیس میں ؟ معلوم نہیں
یوں نہ اپنے دمِ امید کو بہلائے کوئی
کون کہتا ہے گلستاں میں بہار آئی ہے

جی میں آتی ہے کہ اب بارِ غمِ زیست پہ احساں دھر کر
دیگِ گردوں میں ابلتے ہوتے زہراب سے اک خم بھر کر
دیگِ گردوں کہ ابد رنگ شکم میں جس کے
کھولتے دردوں کا ہنگامۂ لافانی ہے
اس زہراب سے خم بھر کے پئے خندوں افقِ دوراں پر
آگ ہی آگ برسنے لگے اس پھولوں بھرے بستاں پر
اب یہی دھن ہے کہ اس ظلمتِ بے پایاں کو
جو مری روح کے ایوان کی زندانی ہے

اٹھ کے پھیلا دوں انہی اونچے درختوں سے ڈھکی راہوں پر
انہی گدراتی ہوئی دھوپ میں لہراتی چراگاہوں پر

اب ارادہ ہے کہ اِن بس بھرے ارمانوں کو
جن کے سایوں میں میری زیست کی ویرانی ہے
گھول دوں جھومتے جھونکوں کے چھلکتے ہوئے پیمانوں میں
سینۂ دشت پہ بجتی ہوئی شہنائیوں کی تانوں میں

چاہتا ہوں کہ یہ زیتون کے جنگل کا سکوت
جس کی وسعت ہے کہ اک عالمِ حیرانی ہے
میری کھوتی ہوئی دنیاؤں کے کہرام سے تھرا اٹھے

اب یہ ٹھانی ہے کہ جمتی ہوئی بوندوں کے یہ بے کل چھینٹے
تیز جھالوں کے یہ چابک سے کہ جن کی زد پر
کبڑے رستوں کی تھکی پیٹھ کی عریانی ہے
یہ دھواں دھوپ ترائی، یہ دھواں دھار پہاڑوں کی فصیل
دور تک چوٹیوں اور بدلیوں کے دیس کی سرحدِ جمیل

برف سی بدلیاں، جن کے لب تر سے پیوست
برف کی چوٹیوں کی دودھیا پیشانی ہے
ہاں یہ سب سلسلۂ رنگ، یہ گہوارۂ حسن و افسوں
میں اسے اپنی دکھی روح کی ان راگنیوں سے بھر دوں
جن کی لہریں کبھی آنسو ہیں، کبھی آہیں ہیں
جن کی تقدیر کبھی آگ، کبھی پانی ہے

کوئی غایت، کوئی منزل، کوئی حاصل سفرِ ہستی کا؟
کوئی مقصود بلندی کا کہ مفہوم کوئی پستی کا؟
کوئی مشعل بھی نہیں، کوئی کرن بھی تو نہیں
شب اندھیری ہے، گھٹا ٹوپ ہے، طوفانی ہے!
بولو اے نغمہ سرایانِ تحیّر کدۂ کاہکشاں
میں کہاں جاؤں، کہاں جاؤں، کہاں جاؤں، کہاں

نغمۂ کواکب[1]

داکوسس:

ناچ ، ناچ ، جھوم ، جھوم
گھوم ، گھوم ، گھوم ، گھوم
دیکھنا ادھر ضرور ، اک نظر
ناچتا ہے نزد و بدور ، بے خبر
دامنِ نگارِ نور ، تھام کر
کہکشاں کے موڑ پر
فاصلوں کا اک ہجوم
ناچ ، ناچ ، گھوم ، گھوم
وسعتِ ابد پناہ ، اک ترنگ
عالمِ شبِ سیاہ ، اک امنگ
منزلیں نشانِ راہ ، سحر رنگ

---

[1] داکوسس ، فیبوکس ، ارناؤس ، پلوطو ، ستاروں کے نام

شعلہ، شعلہ، انگ انگ
آگ، آگ، روم، روم
ناچ، ناچ، گھوم، گھوم

فیبوس:

دیتے جلتے رہے، دیتے جلتے رہے
گُھم گُھم اُڈے، دھوتیں کے دل
جُگ جُگ پھیل گئے کاجل
دَم دَم، دھم دھم گرے محل
مٹتی ہوتی صدیوں میں پل
ڈھلتے رہے
دیتے جلتے رہے
کتنے زمانے، کتنے سپن!
توڑ گئے اپنے درپن
نیر بہاتے رہے نیتن
وقت کے جسم کو گھن گھن
چلتے رہے
دیتے جلتے رہے

اندھیاروں کے زہر پیتے
آنکھوں کو گل رنگ کئے
امرا جالے ، لَو میں لئے
جیون کی منڈلی میں دیتے
جلتے رہے
دیتے جلتے رہے، دیتے جلتے رہے

اروناؤ کس: بھنور بھنور میری نَوکا
کوئی ساحل ہے نہ کنارا
اک پھیلتا بڑھتا دھارا
بہے نگر نگر
میری نَوکا بھنور بھنور
ہر آن رتوں کا میلہ
ہر سمت سمے کا ریلا
چلے گھر گھر
میری نَوکا بھنور بھنور
بوجھ اتنے ہیں کڑیل جن کے

یہ دکھ سکھ، بہتے تنکے
گریں ابھر ابھر
میری نَو کا بھنور بھنور
کہتی ہوئی من کی بانی
تقدیر جہاں کی رانی
پھرے سنور سنور
میری نَو کا بھنور بھنور

پلوطو: کتنی اندھیری رات ہے چکو
دیکھو تہ گُوں کے فتنے
کتنے
روند روند چلے عالم عالم کو، چکو
پیہم
گھور رہے ہیں طوفان ہم کو، چکو
سکھ میں سمولو اِک اِک پل کو
جھلکو
من میں بجھا لو شعلۂ غم کو، چکو

آتے ہوئے قرنوں کا تبسم
ہم تم
جگ مگ دمکو، جھم جھم جھمکو، چمکو!
کتنی اندھیری رات ہے، چمکو

کرۂ ارض:

نہ عکسِ خاک کہیں اور نہ رقصِ نور کہیں
نہ کوئی وادیٔ ایمن نہ شمعِ طور کہیں
بجھی ہے راکھ میں غلطاں مئے طہور کہیں
پڑا ہے شیشۂ افلاک چور چور کہیں
بلوں کے جھنڈ میں لرزے ابد کی پینگ کوئی
نظر کے سامنے، حدِّ نظر سے دور کہیں
مقدروں کے جہاں در جہاں اندھیروں میں
بھٹک نہ جائے مرا شوقِ ناصبور کہیں
یہ اضطرابِ مسلسل کی خونچکاں گھڑیاں
نہیں ان سے بڑھ کے کوئی دولتِ سرور کہیں
اگر ہمیں بھری دنیا میں مسکرا نہ سکے
تو ڈول جائیں گے یہ سلسلے ضرور کہیں

شہر در شہر منادی ہے کہ :-

اے خندۂ فروشانِ حیات
ہر بھی روح کے آنگن میں کھلا ہے چمنِ امکانات!
نہ کوئی سلطنتِ غم ہے نہ اقلیمِ طرب!
زندگی ہی فقط آئینِ جہاں بانی ہے!"

جانے کس تیرہ افق سے یہ گھٹاؤں کے تھرکتے سائے
ماہتابوں کے چمکتے ہوئے سینوں سے نتھر کر آئے
ساتھ لے کر وہ خنک موجِ خمار میں جھونکے
جن کی زد میں میری تپتی ہوئی پیشانی ہے

اپنے سینے میں جگا کر انہی دردوں انہی یادوں کے فسوں
پھر تمناؤں کے تصویر کدے میں نگراں بیٹھا ہوں
سامنے صفحۂ صد رنگ رموزِ کونین!
کانپتی انگلیوں میں موقلم مانی ہے!

میرے خدا میرے دل

میرے ضمیر کے بھیدوں کو جاننے والے
تجھے تو اس کی خبر ہے، میرے خدا، میرے دل
کہ میں ان آندھیوں میں، عمر بھر، جدھر بھی بہا
کوئی بھی دھن تھی، میں اس لہر کی گرفت میں تھا
جو میری سوچ کی سچائیوں میں کھولتی ہے
ہے جس کی روح میں تیری ضَو!

میرے خدا میرے دل
میرے لہو میں، تیری لَو ہے، دھڑکنوں کا الاؤ
تجھے تو اس کی خبر ہے

میرے خدا میرے دل
کہ اس طلسمِ زیاں کے، کسی جھمیلے میں
ذرا کبھی، جو قدم میرے ڈگمگا بھی گئے
تو اک خیالِ ابد موج سلسلوں کا خیال
میرے وجود میں چنگاریاں بکھیر گیا

نہ دھکتی سانس کے ارماں، نہ جلتی مٹی کے بوجھ
نہ کوئی روگ، نہ چنتا، نہ بیں، نہ میرے جتن
جو مجھ میں تھا بھی کوئی گُن، ترے ہی گیان سے تھا
پھر اور ڈوب کے گہرائیوں میں جب دیکھا
تو ہر سسکتی ہوئی قدر کے مقدر میں
نہاں تھے تیرے تقاضے!

مرے خدا مرے دل
ہیں تیری کرنوں میں کڑیاں چمکتے قرنوں کی
تجھے تو اُس کی خبر ہے

مرے خدا مرے دل
کہ اس کرے پہ ہے جو کچھ بھی اس کے پہلو میں ہیں
وہ شعلے، جن پہ شکن ہے تری ہی کروٹ کی
ترے ہی داترے کا جز وہیں، وہ دور، کہ جب
چٹانیں پگھلیں، ستارے جلے، زمانے ڈھلے
وہ گردشیں جنھیں اپنا کے ان گنت سورج
ترے سفر میں بجھے، تو انہی اندھیروں سے
دوام درد کی اک صبح ابھری، پھول کھلے

مہک اٹھی تری دنیا

مرے خدا مرے دل

گھلا ہوا مری سانسوں میں سفر ترا
تجھے تو اس کی خبر ہے

مرے خدا، مرے دل

کہ گو یہی مرا پیکر، خمیر خاک سے ہے
مگر اسی مرے تپتے بدن کی بھٹی سے
کشید ہوتی ہوتی ایک ایک ساعت زیست
وہ گھونٹ زہر کا ہے جو مجھی کو پینا پڑا
یہ زہر کون پیئے ؟ کون اپنے سینے میں
یہ آگ انڈیل سکے، ان ساحلوں سے بھید چنے
جہاں پہ بکھرے ہیں، صدہا صداقتوں کے صدف
یہ زہر کون پیئے ؟ کون بجھتی آنکھوں سے
غروب وقت کی خندق کے پار دیکھ سکے
جہاں ازل کے بیاباں میں، عمر پیاسا ہے
حقیقتوں کا وہ دھارا، کہ جس کی لہروں میں آج
گلوں کا رس بھی ہے، فولاد کا پسینہ بھی !

میرا شعور انہی گھاٹیوں میں بھٹکتا ہے
قدم قدم پہ، میری ٹھوکروں کی زد میں رہیں
کرخت ٹھیکریاں، ان کھٹور ماتھوں کی
جو زندگی میں تیرے آستاں پہ جھک نہ سکے۔
قدم قدم پہ، سیہ فاصلوں کے سنگم پر
بس اک مجھی کو، اس اَن مٹ تڑپ سے حصّہ ملا
تیری جو رس کی صدا میں ہیں، رچ گئے جس کے
یہی تڑپ تیری کایا! یہی تڑپ مرا انت!
جو انت بھی ہو سو ہو، میں تو مٹتی مٹی ہوں
دھڑکتی ریت کے بے انت جھگڑوں میں سدا
رواں رہے ترے محمل

مرے خدا مرے دل
تری ہی آگ کی میٹھی سی آنچ میں مرے دکھ
یہ راز تو ہی جانے

مرے خدا مرے دل
یہ بات کیا، کہ تیرے بے خزاں خزانوں سے
جو کچھ ملا بھی ہے مجھ کو، تو اک یہ ریزۂ درد

ہیں جس کی جھولی میں کھلیان تیرے شعلوں کے
اور اب کہ سامنے، جلتی حدوں کی سرحد ہے
ہر اک سمت میری گھات میں ہیں وہ روحیں
جو اپنے آپ میں اک راکھ کا سمندر ہیں
یہ سایے، بس بھرے، ذی جسم، آہنی سایے
انہی کے گھیرے میں ہیں، اب یہ بستیاں، یہ دیار
کہیں یہ سایے ـــــ جو بپھرائی آرزوؤں کو
سراب زر کی کشش بن کے گدگداتے ہیں
میری لگن کو نہ ڈسنے لگیں ـــــ میں ڈرتا ہوں
کہیں یہ سایے ـــــ یہ کیچڑ کی مورتیں ـــــ جن کے
بدن کے دھبوں پہ رخت حریر کی ہے پھبن
میری کرن کی نہ چھب نوچ لیں ـــــ میں ڈرتا ہوں
کہیں یہ آگ نہ بجھ جائے جس کے انگ میں ہیں
تیرے دوام کی انگڑائیاں! ـــــ میں سوچتا ہوں
نہیں ـــــ یہ نہ ہو سکے گا! ـــــ جو یوں ہوا بھی تو پھر
نہیں! ابھی تو یہ اک سانس، ابھی تو ہے کیا کچھ!
ابھی تو جلتی حدوں کی حدیں ہیں لامحدود

ابھی تو اِس میرے سینے کے ایک گوشے میں
کہیں لہو کے تر بڑوں میں، برگِ مرگ پہ اک
کوئی لرزتا جزیرہ سا تیرتا ہے جہاں
ہر اک طلب تیری دھڑکن میں ڈوب جاتی ہے
ہر اک صدا ہے کوئی دور کی صدا
میرے دل
میرے خدا میرے دل

کون دیکھے گا

جو دن کبھی نہیں بیتا، وہ دن کب آئیگا　　انہی دنوں میں اس اک دن کو کون دیکھے گا
اس ایک دن کو۔ جو سورج کی راکھ میں غلطاں　　انہی دنوں کی تہوں میں ہے۔ کون دیکھے گا
اس ایک دن کو۔ جو ہے عمر کے زوال کا دن
اسی بدن میں نمویاب کون دیکھے گا!
یہ ایک سانس، جھمیلوں بھری، جگوں میں رچی　　اس اپنی سانس میں کون اپنا انت دیکھے گا
اس اپنی مٹی میں جو کچھ امٹ ہے، مٹی ہے　　جو دن ان آنکھوں نے دیکھا ہے کون دیکھے گا
میں روز ادھر سے گزرتا ہوں کون دیکھتا ہے
میں جب ادھر سے نہ گزروں گا کون دیکھے گا!
دو رویہ، ساحل دیوار اور پس دیوار　　اک آئینوں کا سمندر ہے کون دیکھے گا
ہزار چہرے خود آرا ہیں کون جھانکے گا　　مرے نہ ہونے کی ہونی کو کون دیکھے گا
ترخ کے گرد کی رو سے اگر کہیں کچھ پھول
کھلے بھی۔ کوئی تو دیکھے گا۔ کون دیکھے گا!

ریلوے اسٹیشن پر

آہنی، سبز، بنگلے کے قریب
باتوں باتوں میں ایک برگِ عقیق
تو نے جب توڑ کر مسل ڈالا
مجھ کو احساس بھی نہ تھا کہ یہی
جاوداں لمحہ ۔ شاخ دوراں سے
کٹ کے ۔ تا عمر میری دنیا پر
اپنی کملاہٹیں بکھیرے گا
اسی برگِ دریدہ جاں کی طرح

آج بھی ۔ اس دہکتی پٹڑی پر
سیٹیوں کی دھواں اگلتی صدا
گھومتے، گنگناتے پہیّوں کو
جب پیامِ رحیل دیتی ہے
روز سو سنگتیں اجڑتی ہیں!

لاکھ سنجوگ مسکراتے ہیں
آج بھی۔ ریلوے اسٹیشن پر
آہنی، سبز، جنگلے کے قریب
قدِ آدم عقیق کے پودے
تھام کر سرخ دھاریوں والے
زرد پھولوں کے موہنے گجرے
بھری دنیا کے جھگڑوں میں کھڑے
گوشت اور پوست کے وہ پیکر ہیں
اک زمانے سے جن کی زندگیاں
لوٹ کر پھر نہ آنے والوں کی
منتظر، منتظر۔ چراغ بدست
وقت کے جھکڑوں سے کھیلتی ہیں
اسی برگِ دریدہ جاں کی طرح

توسیعِ شہر

بیس برس سے کھڑے تھے جو اس گاتی نہر کے دوار
جھومتے کھیتوں کی سرحد پر بانکے پہرے دار
گھنے، سہانے، چھاؤں چھڑکتے بور لدے چھتنار
بیس ہزار میں بک گئے سارے ہرے بھرے اشجار

جن کی سانس کا ہر جھونکا تھا ایک عجیب طلسم
قاتل تیشے چیر گئے ان ساونتوں کے جسم

گری دھڑام سے گھائل پیڑوں کی نیلی دیوار
کٹتے ہیکل، چھٹتے پنجر، جھڑتے برگ و بار
سہمی دھوپ کے زرد کفن میں لاشوں کے انبار
آج کھڑا میں سوچتا ہوں اس گاتی نہر کے دوار

اس مقتل میں صرف اک میری سوچ لہکتی ڈال
اس پر بھی اب ـــ کاری ضرب اِک ـ اے آدم کی آل

سپاہی

تم اُس وقت کیا تھے
تمہارے محلّوں، تمہارے گھروں میں تو سب کچھ تھا
آسائشیں بھی وسیلے بھی
اس کبریائی کی تمکنت بھی
سبھی کچھ، تمہارے تصرف میں تھا، زندگی کا ہر اک آسرا بھی
کڑے بام و در بھی
خزانے بھی، زر بھی
چمن بھی، ثمر بھی
مگر تم خود اُس وقت کیا تھے
تمہاری نگاہوں میں دنیا دھوئیں کا بھنور تھی
جب اُڑتی ہلاکت کے شہپر تمہارے سروں پر سے گزرے
تمہاری نگاہوں میں دنیا دھوئیں کا بھنور تھی
اگر اُس مقدس زمیں پر

میرا خوں نہ بہتا
اگر دشمنوں کے گرانڈیل ٹینکوں کے نیچے
میری کڑکڑاتی ہوتی ہڈیاں خندقوں میں نہ ہوتیں
تو دوزخ کے شعلے تمہارے معطر گھروندوں کی دہلیز پر بہتے!
تمہارے ہر اِک بیش قیمت اثاثے کی قیمت
اسی سرخ مٹی سے ہے جس میں میرا لہو رچ گیا ہے!

یہ سبز پیڑوں کے سائے

سیہ سنگ، تپتی سڑک پر یہ سرسبز پیڑوں کے سائے
ہوا اس جگہ کتنی ٹھنڈی ہے، جھونکوں پہ سایوں کے دھبّے بھی ہیں کتنے ٹھنڈے
درختوں کے اس جھنڈ سے جب میں گزرا
خنک چھاؤں کی ٹکڑیاں سی میرے جسم پہ تھرتھرائیں
میرے جسم سے گر کے ٹوٹیں
عجب اک اچھوتی سی ٹھنڈک مری روح میں سرسرائی
سہانے دنوں کی انوکھی سی ٹھنڈک
وہ دن کتنے اچھے تھے، جب ایک بھیگی ہوئی سانس کی ریشمی رَو
میرے دل کی چنگاریوں کے پسینے سے مَس تھی !
وہ مبہم سی خوشیاں، جو چھپ چھپ کے، ہر موڑ پر
نِت نئے بھیس میں۔
آ کے روحوں سے ملتی ہیں، مِل کر بچھڑتی ہیں، جیسے
ہواؤں پہ سایوں کے چھدرے سے دھبّے

فضاؤں میں صدہا سفید و سیہ آفتابوں کے بکھرے سے ریزے
سرِ خاک، بے ربط، بے سطر، خاکے
یہ سب کچھ بس اک دو قدم تک
پھر آگے وہی دھوپ، شاداب دردوں کی جانب ہمکتی ہوئی
سنگریزوں پہ بہتی ہوئی۔ دھوپ،
حدِّ عدم تک!

موانست

رات اچانک پھاٹک کا اِک پہیہ رینگا
پگڈنڈی پر اِک آہٹ نے ٹھوکر کھائی

کالے کوس پروں کو اوڑھ کے سونے والی وحشت
پاس کے پیڑ پہ، کندے جھٹک کر چونکی، چیخی
جیسے کوئی اس کی طرف جھپٹا ہو
ڈرتے ڈرتے اس نے نیچے اندھیارے میں جھانکا

"اوہو۔ یہ تو ایک وہی سایہ ہے
جو روشنیوں کے پہلے پھیرے سے بھی پہلے
روز اِدھر سے گزرتا ہے اور پہلی پینگ کے پڑنے سے بھی پہلے
چلتا چلتا اس باڑی میں کھو جاتا ہے......
آج تو جانے کس لرزاں دھبے سے ٹکرایا وہ...... پگلا!"

کوئل نے یہ سوچا۔ پھر بے کھٹکے
پتوں کی اس سیج پہ تھوڑی دیر کو اونگھ گئی وہ
بورتے سحر کے مست بلاوے پر بے ساختہ کوک اٹھنے سے پہلے

ثمرِ خوں

یہ قصہ حاصلِ جاں ہے، اسی میں رنگ بھریں
لہو کی لہر کے لہجے میں، اپنی بات کہیں
دھوئیں میں آگ کے تیشے ہیں، زخم ہیں۔ اب ہم
انہی کڑکتے دھماکوں سے اپنے گیت چنیں!
ہمارے جیتے گھروندے، ہمارے جلتے جتن
یہ مورچے — یہ جیالے سپاہیوں کی صفیں
جلی زمین، سیہ ڈھول، صدقِ خوں کی مہک
قدم قدم پہ یہاں —— مہر و مہ کی سجدہ گہیں
یہ دن بھی کتنے مقدس ہیں، بے بہا ہیں، کہ آج
ہمارا حصہ بھی ہے طالعِ شہیداں میں
اسی تڑختی ہوئی باڑھ میں، ہمیں کو ملیں
سنورتی، سجتی، نکھرتی، دلوں کی اقلیمیں
یہ جینے والوں نے دیکھا کہ اس گروہ میں تھے
وہ جاں نثار —— کہ جو موت کو بھی فتح کریں
میں ان کو طاقِ ابد سے اتار لایا ہوں
یہ شمعیں، جن کی لَویں میرے آنسوؤں میں جلیں

جیون دیس

پیلے چہرے، ڈوبتے سورج! روحیں، گہری شامیں
زندگیوں کے صحن میں کھلتے
قبروں کے دروازے!

سانس کی آخری سلوٹ کو پہچاننے والے گیانی
ڈولتی محرابوں کے نیچے
آس بھرے اندیشے!

بوڑھی، کبڑی دیواروں کے پاؤں چاٹتی گلیاں
ٹوٹتے فرش، اکھڑتی اینٹیں
گزرے دنوں کے ملبے!

دکھے دلوں کے سجدے چنتی پلکیں، بچھڑے پریمی
بجھے جھروکوں سے ٹکراتی
یادیں، ڈھلتے سائے!

بجتی ڈھولک، گاتی سکھیاں، نیر بہاتی خوشیاں
جاگتے ماتھے، سوچتے نیناں
آنے والے زمانے !

خونی بازاروں میں بجتی اِک اِک میلی چوڑی
پنکھیاں جھلتی ننگی باہیں
نیند آنند بگھوڑے !

کنٹھا پہنے، اِک متوالا بالا، ریڑھی والا،
موڑ موڑ پر جیون رت کی
زخمی کلیاں بانٹے !
جینے کے یہ سارے جتن، انمول سمے کی مایا
سدا رہیں اِن سدابہار دکھوں کے روپ سہانے

تو بھی رُک کر اس بھنڈار سے اپنی جھولی بھر لے
تیری تڑپ کا انت یہی ہے
اے دِل، اے دیوانے !

ایک فلم دیکھ کر

دھیرے دھیرے، ایک نڈھال سی لَے میں، ساز بجے
اُس کے انگ انگ نے اِک انگڑائی لی
ابھری رقص کی رَو
تڑپی گھائل سی اِک لَے
لچکی اس کے بدن کی ڈھال
اِک اِک تیز نرت کے ساتھ
اِک اِک بندھن اترا،
پلو ڈھلک ڈھلک کر
رُکے۔ گرے!

سامنے اک
جگ مگ جسم
گرتی مڑتی، ٹوٹ ٹوٹ کے جڑتی، مرمر کی ڈھلوان!
سب کچھ، قاشیں، رگیں، خلیے، مَس، مسام
سب کچھ، ایک تھرکتے بہتے عکس کا جزو

سب کچھ، جسم کی باغی سلطنتوں کی ایک عجب دنیا
گول سڈول کرے ___ انمول زمینیں ___ ساحل ___ جھرنے
دھوپ ___ چاندنی ___ مخمل ___ پھول
سب کچھ، رقص کے روپ میں ڈھلتا، ٹک ٹک چلتا، اک متحرک عکس!
سب کچھ پاس بلاتے، پیاس بڑھاتے، ارمانوں کا سراب

آج اک دوست نے پاس بلا کر، چائے پلا کر
پہلے تو کچھ دیر ادب اور شعر کی باتیں کیں
مجھ سے میری اک نظم سنی
اور پھر اس کے بعد یہ نظم، کہ جس کے سارے قرینے تھے
مجھ پر طنز، مری اس بوسیدہ سی نظم پہ طنز،
دونوں اتنے لبادوں میں!
باہر نکلا تو سنسان سڑک تھی، شب خزاں تھی
ٹھنڈی تیز ہوا میں ننگی شاخیں ناچ رہی تھیں!

بھکارن

تیز قدموں کی آہٹوں سے بھری
رہگذر کے دو رویہ، سبزہ و کشت
چار سو ہنستی، رنگتوں کے بہشت
صد خیابانِ گل، کہ جن کی طرف
دیکھتا بھی نہیں کوئی راہی!

سرخ پھولوں سے اک لدی ٹہنی
آن کر بچھ گئی ہے رستے پر
کنکروں پر جبیں رگڑتی ہے
راہگیروں کے پاؤں پڑتی ہے

"میں کہاں روز روز آتی ہوں
ہے مرے کوچ کی گھڑی نزدیک
جانے والو! بس اک نگاہ کی بھیک"

جویا

تب میرا دل بجھ جاتا ہے
میں ہوں جگ جیون کے جوہر ڈھونڈنے والے جوہریوں کا جویا
میرا دل بجھ بجھ جاتا ہے
اس پتلے، گیلے گیلے آبی کاغذ پر
جو لیں، دو رنگ، اس پانی پر چسپیدہ ہے
جس دن بادی کا پانی لگتا ہے
اور سڑک کے ساتھ، اک گھنے دخیرے والی کیاری
تھمے ہوتے اور رچے ہوتے پارے سے بھر جاتی ہے
جب ان سطحوں پر کرنوں کی دھول بکھر جاتی ہے
اور ہوا کا ہلکے سے ہلکا بھی جھونکا ان کو چھونے سے ڈرتا ہے
تب تو ادھر ادھر ہی میرا دل کھچتا ہے
مجھ کو بھاجاتی ہے
اچھے اچھے خیالوں کی جتریلی چادر اوڑھ کے

ان چھتناروں میں یہ بھٹکنے والی ٹھنڈک !

سب کو تج کے، میں جب اُس ٹھہرے پانی پر
سایوں اور شعاعوں کی جھل مل میں کھو جاتا ہوں
سارا آسمان اسی اجلے پانی پہ اتر کر مجھ کو دیکھ رہا ہوتا ہے
میں ہوں جگ جیون کے جوہر ڈھونڈنے والے جوہریوں کا جویا!

یہ سب دن

یہ سب دن
تنہا، نایکسو
یہ سب الجھاوے
کالی خوشیاں کالے غم
اے رے دل !
رہا ہے تو اب تک
کن بھگتا نوں میں !
اور اب بھی تو آگے ہے
ایک وہی گزران، دنوں کی، جس کی رو
جذبوں اور خیالوں میں چکراتی ہے
ہم جیتے ہیں، ان روحوں کو بھلانے میں
سدا جو ہم کو یاد کریں
سدا جو ہم کو اپنے مشکیں غرفوں سے دیکھیں
جیسے پورب کی دیوار پہ انگوروں کی بیل میں

بڑھتے، رکتے، ننھے ننھے، چمکیلے نقطے
کرنوں کے ریزے
جو ہر صبح کو
ہر جھونکے کے ساتھ
ان پتوں کی درزوں میں
اے رے دل!
تیری خاطر جلتے بجھتے ہیں
کس کی خاطر؟ — یہ اک صبح!
کس کی خاطر؟ — آج کا یہ اک دن!
کیسا دن؟
یہاں تو ہے بس ایک وہی اندھیر دنوں کا جس کی رد
روحوں میں اور جسموں میں چکراتی ہے۔

گوشۂ امن

میلی میلی نگاہوں کی اس بھیڑ کے اندر اور بھی گھس کر دیکھو......
قاتل جبڑوں کے جڑتے دندانوں میں شاید اک رخنہ امن کا بھی ہو،
اپنے بچاؤ میں اس سے زیادہ کیسے بچے رہو گے،
پہلے ہی سے اس دیوار تک ہٹتے ہوتے ہو جس کے آگے.... آگ ہے
ان شعلوں کے چلتے آروں کے اندر ہی کوئی رخنہ امن کا ڈھونڈو

یہ مامن تو تمہارے دلوں کے کسی گوشے میں جدا نہیں ہے
یہ مامن تو تمہاری دنیاؤں کے کسی گوشے میں جدا نہیں ہے

اندر بھی باہر بھی، ایک ہی لشکر ہے، جس کی دو ٹکڑیاں
جنگ میں ہیں، آپس میں، تمہارے دلوں کی سرحد پر جس کے اندر کی جانب، اتنی دُور
تک تم کو پیچھے ہٹنا پڑا ہے:
اس جمگھٹ میں، اب اک بار تو ہلّہ بول کے اک وہ گوشہ امن کا اپنے واسطے ڈھونڈو

اک وہ گوشہ،
— اس جمگھٹ میں اور تمہارے دلوں میں وہ یک جا گوشہ
جس پر زندگی کے لشکر کی دو متحارب ٹکڑیوں کا مشترکہ قبضہ رہا ہے اب تک....

باگیں موڑ بھی لے

ٹیڑھے منہ اور کالی باتیں
کانٹے بھرے ہوتے آنکھوں میں
یہ دنیا ـــــ یہ دنیا والے
تو مت جا اس اور ـــــ باگیں موڑ بھی لے

دلوں کی اس دلدل کے کنارے
روپ گھمنڈ کے پتلے سارے
اک پر دوسرا کیچ اچھالے
اس تٹ پر مت ڈول ـــــ باگیں موڑ بھی لے

آگے بِس کی لہر ہے جل تھل
کسی کی بابت ماتھے پر بَل
اے رے دکھے ہوتے دل والے
یوں مت یوں مت سوچ ـــــ باگیں موڑ بھی لے

کون دیس گیو

کون دیس گیو
نیناں
کون دیس گیو
رُت آئے، رُت جائے، ہماری عمر کٹے رو رو
کجرارے، متوارے نیناں، کون دیس گیو
دیکھتے دیکھتے اس نگری میں چاروں اور نور بہا
ایک گزرتی رتھ سے چھلکا اُنڈ کے جوبن اہا اہا
راہ راہ پہ پلک پلک نے سیس نوا کے کہا
بادر ہی لہرو
رس کے شہرو
نینو، ٹھہرو، ٹھہرو!
چھین نہ لو ان ہنستے لمحوں سے سکھ کا
سانس اک رہا سہا
دھول اُڑی اور پھول گرے
لمحے، خوشبوئیں، جھونکے

اُبھرے ، چھپیے ، گھٹتے گئے
ایدھر دیکھیں ، اودھر دیکھیں ، دل کے سنگ نہ کو
کون دیس گیو
کجرارے ، متوالے نیناں ، کون دیس گیو
اب ان تپتے ویرانوں میں
کانٹے چُن چُن پور دکھیں
جانے تم کس پھول بھبوم میں جھوم جھوم ہنسو
کون دیس گیو
کجرارے او ! متوارے او ، نیناں
کون دیس گیو

زندگی اے زندگی

خرقہ پوش و پا بہ گِل
میں کھڑا ہوں تیرے در پر زندگی
ملتجی و مضمحل
خرقہ پوش و پا بہ گِل
اے جہانِ خار و خس کی روشنی
زندگی اے زندگی!
میں ترے در پر، چکتی چلمنوں کی اوٹ سے
سُن رہا ہوں قہقہوں کے دھیمے دھیمے زمزمے
کھنکھناتی پیالیوں کے شور میں ڈوبے ہوئے
گرم، گہری گفتگو کے سلسلے
منتقل آتش بجاں کے متصل
اور ادھر، باہر گلی میں، خرقہ پوش و پا بہ گِل
مَیں ـــ کہ اک لمحے کا دل
جس کی ہر دھڑکن میں گونجے دو جہاں کی تیرگی
زندگی، اے زندگی!

کتنے سائے محوِ رقص
تیرے در کے پردۂ گل فام پر
کتنے سائے، کتنے عکس
کتنے پیکر محوِ رقص
اور اک تو، کہنیاں ٹیکے خمِ ایام پر
ہونٹ رکھ کر جام پر
سُن رہی ہے ناچتی صدیوں کا آہنگِ قدم
جاوداں خوشبوں کی بجتی گٹکڑی کے زیر و بم
آنچلوں کی جھجھناہٹ، پائلوں کی چھم چھم!
اس طرف باہر سرِ کوئے عدم
ایک طوفان، ایک سیلِ بے اماں
ڈوبنے کو ہیں مرے شام و سحر کی کشتیاں
اے نگارِ دل ستاں!
اپنی تٹ کھٹ انکھڑیوں سے میری جانب جھانک بھی
زندگی، اے زندگی!!

ہری بھری فصلو

ہری بھری فصلو
جُگ جُگ جیو، پھلو
ہم تو ہیں بس دو گھڑیوں کو اس جگ میں مہمان
تم سے ہے اس دیس کی شوبھا، اس دھرتی کا مان
دیس بھی ایسا دیس کہ جس کے سپنے کے ارمان
آنے والی مست رُتوں کے ہونٹوں پر مسکان
جھلکتے ڈنٹھل، پکتے بالے، دھوپ رچے کھلیان
ایک ایک گھروندا خوشیوں سے بھرپور جہان
شہر شہر اور بستی بستی جیون سنگ بسو
پہنو روپ سجو
دامن دامن، پتّو پتّو، پھولی پھولی ہنسو
ہری بھری فصلو
جُگ جُگ جیو پھلو
قرنوں کے بجھتے انگار، اک موج ہوا کا دم
صدیوں کے ماتھے کا پسینہ، پتّیوں پر شبنم

دور زماں کے لاکھوں موڑ، اک شاخِ حسین کا خم
زندگیوں کے تپتے جزیروں پر رکھ رکھ کے قدم
ہم تک پہنچی عظمتِ آدم ، طنطنۂ آدم
جھومتے کھیتو! ہستی کی تقدیرو! رقص کرو
دامن دامن، پُھولو پَھلو، جھولی جھولی ہنسو
چندن روپ سجو
ہری بھری فصلو
جُگ جُگ جیو کھیلو

غیر مطبوعہ

سہرا

ہدیۂ صمیمیت و اخلاص بتقریب مسرت نصیب شادی حبیب لبیب چودھری شیر محمد شعری

حسین کلیاں کھلی ہیں شراب لا اے دوست
فضائیں گاتی ہیں تو بھی رباب اٹھا اے دوست

ہوا میں پریوں کے قدموں کی مست چاپ اے دوست
یہ کہہ رہی ہے کہ نغمہ کوئی الاپ اے دوست

وہ نغمہ جس کو ٹہنیوں کی مستیاں چومیں
وہ نغمہ جس سے ستاروں کی بستیاں جھومیں

وہ گیت جس کے سروں میں ہو پریم رس کی مٹھاس
وہ گیت جس سے بجھے زندگی کی روح کی پیاس

وہی ترانۂ مدہوش گاتے جا اے دوست
دلوں میں کیف کے دیپک جلاتے جا اے دوست

یہ کائنات تو اک پردۂ رباب اے دوست
بہشت تیری جوانی کا ایک خواب اے دوست

بسے ہیں تیرے ترانوں کے آسمانوں میں
تو آسمانوں کے جلوے ترے ترانوں میں

یہ زمزمے ہیں تیری گنگڑی کی آہٹ کے
کہ پھول چٹکے ہیں پریوں کی مسکراہٹ کے

یہ پھول جن سے بنا ہے تیرا حسین چہرا
یہ نکہتوں میں سمویا ہوا حسین چہرا

یہ سہرا مژدہ صد ابتہاج ہے اے دوست
یہ تیرے سر پہ محبت کا تاج ہے اے دوست

افق پہ رنگِ شفق کا ہے جب تلک غازہ
رہے یہ شوخ سا سہرا اترا تر و تازہ

یہ چند شعر ہیں میرے ریاضِ فکر کے پھول
میرے عزیز میرے شبیر میری نذر قبول

فروری (۱۹۳۹)

غیر مطبوعہ

سہرا

بمقریب سعید شادی خانہ آبادی کیپٹن حاجی احمد کلیم شعری پسر شیر محمد شعری

خوشا یہ سہرا یہ گل فشاں تر اگو ہریں زرنگار سہرا
حسین سہرا، جمیل سہرا، مسرتوں کی بہار سہرا

تجھے مبارک یہ رنگ کیف و نشاط کیپٹن کلیم شعری
تجھے مبارک یہ دن یہ خوشیاں ہے جن کا آئینہ دار سہرا

جلیل افسر عظیم انسان، شفیق بھائی شریف بیٹا
تیرے ہی وصفوں کا ایک زیور، یہ تیرے رُخ کا سنگار سہرا

ریاضِ جنت میں آج شاداں ہے، چوہدری پیر بخش کی روح
ہوا ہے ایسی دمک جھمک سے طلوع یہ ذی وقار سہرا

جنابِ شعری کے دل کی ٹھنڈک یہ ساعت پر طرب ہے جس میں
ہے ان کے صدقِ دعا سے تازہ یہ حاصلِ روزگار سہرا

خدا رکھے تیرے سر پہ اس روحِ خوش تمنا کا سایہ دائم
یہ تیسرا سہرا ہے جس کی دنیا میں ایک عمر بہار سہرا

ہیں تیرے سہرے کے روپ کیا کیا، حیات کی ضو گلوں کا پرتو
بہ دِل، فروغِ حیات سہرا، بہ رخِ دُرّ شہوار سہرا

میری دعا ہے مقدروں کی بھری بہاروں میں لہلہاتے
ہمیشہ بن کر سجل گلوں سے لدی ہوئی شاخسار سہرا

جو کلکِ امجد نے کھینچ دی ہیں یہ برگِ زر پھول پھول سطریں
قبول ہو یہ خلوصِ دِل سے لکھا ہوا یادگار سہرا

(۱۹، دسمبر ۱۹۷۳ء)

دس بڑے مسلمان

مصنف : محمد اسماعیل پانی پتی

اسلام کی تاریخ نے اپنے دور اول میں ایسی عظیم الشان و عظیم المرتبت شخصیات کو ابھارا جو آج کے مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ دنیا بھر کے لئے روشنی کے میناروں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ابوبکر صدیق اکبرؓ کی رفاقت عمر فاروق رضہ کے عدل، جناب عثمان ذوالنورین کی طہارت، حضرت علی شیر خدا کے علم اور شجاعت، خاتون جنت امہات المومنین خدیجۃ الکبریٰ کے خلوص اور عائشہ صدیقہ کے ایثار، ابوعبیدہ رضہ کی شجاعت، امیر معاویہ رضہ کی سیاست و فراست، شہید کربلا حسینؓ کی صداقت کی نظیر تاریخ اسلام ہی میں ملیں تاریخ انسانیت میں ناپید ہے۔ ان ہستیوں کی زندگی اور کردار سے ہم کیا کچھ نہیں سیکھ سکتے ایک بار ضرور پڑھئے

ہمارے غازی ہمارے شہید

مولف : آغا اشرف

ہم نے ہندوستان سے سترہ روزہ جنگ میں خالدؓ و طارقؓ اور محمد بن قاسم و بابر جیسے ان گنت جوان اپنے اندر پائے جنہوں نے دشمن کے ہر وار کا خشکی، سمندر اور فضا میں منہ توڑ جواب دیا تھا۔ یہ کتاب پاک بھارت جنگ کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ ایک ایک واقعہ، ایک ایک محاذ کا تذکرہ بھی، اور قلم سے جہاد کرنے والوں کی نظم و نثر تحریریں بھی ایک جگہ جمع ہو گئی ہیں

ساڑھے آٹھ سو صفحات، تصاویر اور نقشوں کے ساتھ

★ مجید امجد

۲۹ جون ۱۹۱۳ء میں جھنگ میں پیدا ہوئے ـ "عروج" کے مدیر رہے ـ ملازمت کے سلسلے میں پاکستان کے مختلف شہروں میں قیام پذیر رہے ـ جھنگ کو چھوڑ کر ساہیوال میں مستقل سکونت اختیار کی اور وہیں ۱۱ مئی ۱۹۷۴ء میں وفات پائی مگر جھنگ میں مدفون ہوئے ـ

شاعری کے مجموعے "شب رفتہ" اور "شب رفتہ کے بعد" شائع ہو چکے ہیں ـ کلام کا انتخاب "ان گنت سورج" کے نام سے شائع ہوا ہے جسے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے مرتب کیا ہے ـ

★ محمد حیات سیال (مرتب)

۱۴ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں جھنگ میں ہوئے ـ پنجاب یونیورسٹی سے ایم ـ اے اُردو اور فارسی کے امتحانات پاس کیے ـ آج کل گورنمنٹ کالج جھنگ میں شعبۂ اُردو کے صدر ہیں ـ تصنیف و تالیف سے گہری دلچسپی ہے ـ

مطبوعہ : احوال و نقد وجہی ، احوال و نقد غالب ، تجلیات اقبال پریچھر ، اقبال غیر مسلموں کی نظر میں ـ

غیر مطبوعہ : اقبال اور حسین ، عرفان اقبال ، پنجابی کی ایک انوکھی صنف ، احوال و نقد حالی ، نقد یلدرم ـ بہترین ایرانی افسانے ، غبار کارواں ـ